جلد ٦٦ نومبر ۱۹٦٦ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

اِسلام کا نظامِ حکمرانی کیا ہے؟

خلافت یا ملوکیّت

- خلافتِ راشدہ کی بُنیادی خصوصیات۔
- خلافت اور ملوکیت کا فرق۔
- اِسلامی تاریخ پر ملوکیت کے اثرات۔
- مصلحینِ اُمت کے روشن کارنامے۔

مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی

کی تازہ ترین تحقیقی تالیف

خلافت و ملوکیّت

میں مطالعہ فرمائیے

اِسلامی تاریخ اور سیاسیات کے طلباء کیلئے ایک بیش قیمت کِتاب

اعلیٰ ایڈیشن ۸/۲۵ روپیہ ــــ سستا ایڈیشن ۴/۷۵ روپیہ

۳۱ اکتوبر ۱۹۶۶ء تک

موصول ہونے والی فرمائشوں پر صرف

۶/۵۰ روپیہ اعلیٰ ایڈیشن ــــ ۳/۵۰ روپیہ سستا ایڈیشن

علاوہ محصول ڈاک مہیّا کی جائے گی۔ آج ہی ایک خط لکھ کر اپنی جلد محفوظ کرا لیجیے ــــ

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	نومبر ۱۹۶۶ء	جلد ۶۶

ماہنامہ ترجمان القرآن

سالانہ چندہ — اس شمارے کی قیمت

سات روپے — ۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور — ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلیشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیتی ہے حالانکہ اُس کے نظریات اور اشتراکی افکار کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ آج بھی دنیا میں بے شمار رہبرانِ قوم ایسے ہیں جو اشتراکیت کے نظریۂ مساوات اور اس کے تصورِ فلاح کو اپنانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کانفرسوں اور اخباری بیانات میں اس کی مدح سرائی میں بھی زبان کے جوہر دکھاتے ہیں، لیکن اُن کی قوموں میں اشتراکیت کا درخت کسی طرح مثمر نہیں ہوتا بلکہ وہاں انسانیت سرمایہ دارانہ نظام کے مصائب برداشت کرتی رہتی ہے۔ بھارت کے پنڈت نہرو اور اسی قبیل کے دوسرے لیڈر اشتراکیت کے ساتھ کتنی غیر معمولی وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہاں چین کی طرح کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ مصر کے کرنل ناصر اپنے آپ کو اشتمالیت کا کتنا فدائی ظاہر کرتے ہیں، لیکن مصر میں آج اسی طرح غربت، افلاس اور طبقاتی کشمکش موجود ہے جو فاروق کے وقت میں تھی۔ مصری عوام کی معاشی حالت پہلے سے بدتر ہے اور کرنل صاحب کی نعرہ بازی کسی جہت سے بھی مؤثر ثابت نہیں ہو رہی۔

میری ان گزارشات کا مقصد یہ نہیں کہ میرے نزدیک کسی قوم کی آئیڈیالوجی یا اُس کا نصب العین کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اچھی صحت مند، انقلاب انگیز اور حیات آفریں آئیڈیالوجی واقعی اپنے اندر بے پناہ تاثیر رکھتی ہے اور اس کے مقابلے میں ناقص آئیڈیالوجی اُس کے علمبرداروں کے اندر کئی قسم کے ذہنی اور جذباتی عوارض پیدا کرتی ہے۔ میری گزارش کا اصل مدعا یہ ہے کہ آئیڈیالوجی خواہ کیسی ہی ہو، اگر اُسے کوئی قوم دل و جان سے اپنالے اور اُسے دنیا میں سربلند کرنے کا عزم کرے تو پھر اُس کے اندر زندگی کی حرارت اور ولولہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ناقص آئیڈیالوجی کو اپنانے کے بعد اُس کے مضر اثرات فوراً ظاہر ہونے لگیں اور قوم اسے جلد ترک کر دے جیسے جرمن قوم نے ہماری آنکھوں کے سامنے فاشزم کو خیرباد کہا ہے۔ کیونکہ نسلی تفوق کے جس غلط فلسفے سے اس آئیڈیالوجی

کا خمیر تیار ہوا تھا اُس سے جرمن قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس لیے اُس نے جلد ہی اُس سے اپنی جان چھڑا لی۔ لیکن جہاں تک زندگی کی حرکت و حرارت کا تعلق ہے اس ناقص آئیڈیالوجی نے بھی جرمن قوم پر وہی اثرات مرتب کیے جو اشتراکیت نے چین اور روس میں مرتب کیے ہیں۔ ہمیں اس وقت کسی آئیڈیالوجی کے اچھے اور بُرے ہونے سے کوئی بحث نہیں۔ اُس کے مفید اور مضر اثرات سے کوئی سروکار نہیں، ہمیں یہاں، صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جب دنیا کی کوئی قوم کسی نظریۂ زندگی یا مقصدِ حیات کو دل و جان سے اپناتی ہے اور اُسے زندگی کی غایت الغایات سمجھ کر اُس کے لیے سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جاتی ہے تو پھر لازمی طور پر اُس کے اندر قوت و توانائی پیدا ہوتی ہے۔ قوم کی حرکت و حرارت کے لیے کسی آئیڈیالوجی کا اچھا یا بُرا ہونا اتنا اثر انگیز نہیں ہوتا جتنا کہ اُسے اپنانے میں خلوص اور اُسے سربلند کرنے کے لیے قربانی کا جذبہ مؤثر ہوتا ہے۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جب کسی قوم نے کسی نظریۂ حیات کو پُورے خلوص کے ساتھ اپنایا تو پھر اُس کے اندر زندگی کی غیر معمولی حرکت و حرارت پیدا ہوئی۔ اُس نے جس نسبت سے اُس کے ساتھ وابستگی پیدا کی اُسی تناسب سے اس کے افکار میں یکسوئی پیدا ہوئی اور اس کے عمل میں جوش رہتا ہوا۔ نصب العین کے عشق نے اس کے دل و دماغ کو جھنجھوڑا، اس کے مُردہ احساسات میں خونِ زندگی دوڑایا، اُس کی مقناطیسی کشش نے اس کی منتشر قوتوں کو سمیٹا، ان کے درمیان ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کی اور انہیں تعمیر و ترقی پر لگانے کا بے پناہ جذبہ پیدا کیا۔ مقصد کے ساتھ محبت اور نصب العین کا عشق وہ طاقت ہے جو راکھ کے ڈھیر کو چنگاریوں میں بدل دیتا ہے، جس کی توانائی سے بنجر زمینیں اور چٹیل میدان چمن زار بن جاتے ہیں۔ اگر قوموں کے عروج و زوال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ نصب العین کے ساتھ مخلصانہ وابستگی اور اُسے اپنانے کی دُھن اور سربلند دیکھنے کی لگن ہی کسی قوم کی ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔ چشمِ فلک نے آج تک کسی ایسی قوم کو نہیں دیکھا جس نے بے مقصد رہ کر دنیا میں عزت و احترام کا کوئی مقام حاصل کیا ہو۔

جب کوئی قوم کسی نصب العین کو اپنا مقصدِ حیات اور اس کے حصول کو اپنی جدوجہد کا ہدفِ مقصود ٹھہراتی ہے تو اس کی زندگی میں ایک تنظیم اور یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس نصب العین اور اس کے حصول کو اپنی زندگی کی غایتِ اُولیٰ بنا کر پھر اُسی کے مطابق اپنی حیات کے دوسرے شعبوں کو ترتیب دیتی ہے۔ اسی نصب العین کی روشنی میں وہ کائنات کی مختلف چیزوں، تعلقات کے مختلف رشتوں اور فکر و عمل کے مختلف شعبوں کی قدر و قیمت متعین کرتی ہے۔ اسی نصب العین سے اس کے قلب و نگاہ کے زاویے ایک خاص رُخ اختیار کرتے ہیں، اور اس کے پسند و ناپسند اور خوب و ناخوب کے پیمانے ایک مخصوص سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ پھر نصب العین کی کشش افراد کے درمیان محبت و اخوت کے تعلقات قائم کرتی ہے اور انہیں راہ کی ساری مشکلات سے بے نیاز کر کے منزلِ مقصود کو حاصل کرنے پر سرگرمِ عمل کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نصب العین کا عشق وہ مے ہے جس کے نشے میں انسان زندگی کے سارے مصائب اور آلام بھول جاتا ہے اور اس راہ میں اُسے جو مشکلات اور دشواریاں پیش آتی ہیں انہیں بخوشی گوارا کرتا ہے۔

بعض حضرات کو اکثر یہ کہتے سُنا گیا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اسلام کی صورت میں ایک نہایت روشن اور تابناک نصب العین موجود ہے، لیکن ان کی زندگیوں میں تو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کے بارے میں اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ نظم و ضبط ان کے ہاں مفقود ہے، محبت و اخوت کے رشتے ان کے ہاں ناپید ہیں کسی تخلیقی قوت کا ان کے ہاں نام و نشان نہیں ملتا۔ الغرض ان کے ہاں ہر اُس شے کا فقدان ہے جسے دیکھ کر اس قوم کے مستقبل کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کی جا سکے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ انسانوں کا یہ انبوہِ کثیر جسے آج کل اُمتِ مسلمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مادر پدر آزاد لوگوں کی بھیڑ ہے جن کے سامنے کوئی منزلِ مقصود نہیں، جن کی زندگیوں کے اندر کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، جن کے درمیان کوئی قدرِ مشترک نہیں، جن کا کوئی اصول و اخلاق نہیں، اور یہ ہجوم یونہی بے مقصد، سخت افراتفری کے عالم میں بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ غیر مسلم قومیں ایک طرف کھڑی اس کا تماشہ

دیکھ رہی ہیں اور وہ بھیڑوں کے اس گلّے سے اپنی ضرورت کے مطابق جس وقت چاہتی ہیں مطلوبہ تعداد میں بھیڑیں الگ کر لیتی ہیں۔ جب ان کے دل میں ان کا رُخ موڑنے کی خواہش ہوتی ہے تو وہ تھوڑی سی عیاری کے ساتھ انہیں دوسری سمتوں پر ڈال دیتی ہیں۔ اور اگر یہ بھیڑیں ذرا سر اٹھا کر چلنے کی جسارت کرتی ہیں تو انہیں آپس ہی میں لڑا دیا جاتا ہے، یا بھیڑوں کے لباس میں ان کے اندر چند بھیڑیے چھوڑ دیئے جاتے ہیں جو انہیں برباد کر دیتے ہیں۔

کسی نصب العین کے ساتھ وابستگی یا کسی مقصد سے محبت کا معیار ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کوئی فرد یا قوم اس کے حصول کے لیے کتنی بڑی قربانی کر سکتی ہے۔ یہ قربانی اپنی خواہشات و تمناؤں کی بھی ہو سکتی ہے، اپنی اغراض اور اپنے ذاتی مفاد کی بھی، اپنے اوقات اور اپنی محنتوں کی بھی، اپنے مال و متاع کی بھی اور سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کی بھی۔ کسی فرد یا قوم کو جتنا کوئی مقصد عزیز ہوگا اتنی ہی بڑی قربانی وہ اس کے لیے دینے پر آمادہ ہوگی۔ نہ صرف آمادہ ہوگی بلکہ اُسے دے کر بڑی مسرور ہوگی اور اسے اپنی حیاتِ مستعار کا سب سے قیمتی اثاثہ تصوّر کرے گی۔ اِس ایثار پر اُس کے اندر محرومی کا کوئی احساس نہ پیدا ہوگا بلکہ وہ اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی خیال کرے گی۔ وہ اس مقدس فرض کو کوئی بوجھ سمجھ کر طوعاً کرہاً سرانجام نہ دے گی بلکہ اسے پوری خوشدلی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے گی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان روپے پیسے، مال و متاع، تعلقات و مفادات کی قربانی تو کیا جان تک کو نچھاور کرنے میں ایک سکون محسوس کرتا ہے اور تختۂ دار پر لٹک جانے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے۔ زبان سے کسی آئیڈیالوجی کے ساتھ وابستگی کا دعویٰ تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ وابستگی اسی صورت میں مؤثر ہوتی ہے جب اس کے دعویدار اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ یہ آئیڈیالوجی ہی اُن کی متاعِ حیات اور غایت الغایات ہے اور اس پر زندگی اور اس کے ساز و سامان اور اس کے عیش و آرام کو بآسانی قربان کیا جا سکتا ہے۔

تفہیم القرآن

الطُّور

نام پہلے ہی لفظ "والطُّور" سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضامین کی اندرونی شہادت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی مکہ معظمہ کے اُسی دَور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۂ ذاریات نازل ہوئی تھی۔ اِس کو پڑھتے ہوئے یہ تو ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اِس کے نزول کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف اعتراضات اور الزامات کی بَوچھاڑ ہو رہی تھی، مگر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ظلم وستم کی چکّی زور شور سے چلنی شروع ہو گئی تھی۔

موضوع اور مباحث اس کے پہلے رکوع کا موضوع آخرت ہے۔ سورۂ ذاریات میں اُس کے امکان اور وجوب اور وقوع کے دلائل دیئے جا چکے تھے، اس لیے یہاں اُن کا اعادہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ آخرت کی شہادت دینے والے چند حقائق و آثار کی قسم کھا کر پُورے زور کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ یقیناً واقع ہو کر رہے گی اور کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اسے برپا ہونے سے روک دے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ پیش آئے گی تو اس کے جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہو گا، اور اسے مان کر تقوٰی کی روش اختیار کر لینے والے کس طرح اللہ کے انعامات سے سرفراز ہونگے۔

اس کے بعد دوسرے رکوع میں سردارانِ قریش کے اُس رویّے پر تنقید کی گئی ہے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ آپ کو کبھی کاہن، کبھی مجنون اور کبھی شاعر قرار دے کر عوام الناس کو آپ کے خلاف بہکاتے

تھے تاکہ لوگ آپ کے لائے ہوئے پیغام کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہ کریں - وہ آپ کی ذات کو اپنے حق میں ایک بلائے ناگہانی سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ کوئی آفت اِن پر نازل ہو جائے تو ہمارا اِن سے پیچھا چھوٹے - وہ آپ پر الزام لگاتے تھے کہ یہ قرآن آپ خود گھڑ گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کر رہے ہیں اور یہ معاذ اللہ ایک فریب ہے جو آپ نے بنا رکھا ہے - وہ بار بار طنز کرتے تھے کہ خدا کو نبوت کے لیے ملے بھی تو بس یہ صاحب ملے - وہ آپ کی دعوت و تبلیغ سے ایسی بیزاری کا اظہار کرتے تھے جیسے آپ کچھ مانگنے کے لیے اُن کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے آپ سے مُنہ چھپاتے پھرتے ہیں - وہ آپس میں بیٹھ بیٹھ کر سوچتے تھے کہ آپ کے خلاف کیا چال ایسی چلی جائے جس سے آپ کی اِس دعوت کا خاتمہ ہو جائے - اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے انہیں اس امر کا کوئی احساس نہ تھا کہ وہ کیسے جاہلانہ عقائد میں مبتلا ہیں جن کی تاریکی سے لوگوں کو نکالنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالکل بے غرضانہ اپنی جان کھپا رہے ہیں - اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِسی رویے پر تنقید کرتے ہوئے پے در پے کچھ سوالات کیے ہیں جن میں سے ہر سوال یا تو اُن کے کسی اعتراض کا جواب ہے یا اُن کی کسی جہالت پر تبصرہ - پھر فرمایا ہے کہ ان لوگوں کو آپ کی نبوت کا قائل کرنے کے لیے کوئی معجزہ دکھانا قطعی لاحاصل ہے، کیونکہ یہ ایسے ہٹ دھرم لوگ ہیں کہ اِنہیں خواہ کچھ بھی دکھایا جائے، یہ اُس کی کوئی تاویل کر کے ایمان لانے سے گریز کر جائیں گے -

اس رکوع کے آغاز میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اِن مخالفین و معاندین کے الزامات و اعتراضات کی پروا کیے بغیر اپنی دعوت و تذکیر کا کام مسلسل جاری رکھیں، اور آخر میں بھی آپ کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ صبر کے ساتھ اِن مزاحمتوں کا مقابلہ کیے چلے جائیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے - اِس کے ساتھ آپ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو دشمنانِ حق کے مقابلے میں اٹھا کر

اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ وہ برابر آپ کی نگہبانی کر رہا ہے۔ جب تک اُس کے فیصلے کی گھڑی آئے، آپ سب کچھ برداشت کرتے رہیں اور اپنے رب کی حمد و تسبیح سے وہ قوت حاصل کرتے رہیں جو ایسے حالات میں اللہ کا کام کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

قسم ہے طور کی[1]، اور ایک ایسی کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے[2]، اور آباد گھر کی[3]، اور اونچی چھت کی[4]، اور موجزن سمندر کی[5]، کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا

---

[1] طُور کے اصل معنی پہاڑ کے ہیں۔ اور الطُّور سے مراد وہ خاص پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔

[2] قدیم زمانے میں جن کتابوں اور تحریروں کو زمانۂ دراز تک محفوظ رکھنا ہوتا تھا انہیں کاغذ کے بجائے ہرن کی کھال پر لکھا جاتا تھا۔ یہ کھال خاص طور پر لکھنے ہی کے لیے رقیق جِلد یا جھلی کی شکل میں تیار کی جاتی تھی اور اصطلاح میں اسے رَق کہا جاتا تھا۔ اہلِ کتاب بالعموم توراۃ، زبور، انجیل اور صُحُفِ انبیاء کو اِسی رَق پر لکھا کرتے تھے تاکہ طویل مدت تک محفوظ رہ سکیں۔ یہاں کھلی کتاب سے مراد یہی مجموعۂ کتب مقدسہ ہے جو اہلِ کتاب کے ہاں موجود تھا۔ اُسے "کھلی کتاب" اِس لیے کہا گیا ہے کہ وہ نایاب نہ تھا، پڑھا جاتا تھا، اور بآسانی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔

[3] "آباد گھر" سے مُراد حضرت حسن بصری کے نزدیک بیت اللہ، یعنی خانۂ کعبہ ہے جو کبھی حج اور عُمرہ اور طواف و زیارت کرنے والوں سے خالی نہیں رہتا۔ اور حضرت علی، ابن عباس، عِکرِمہ، مُجاہد، قَتَادہ، ضَحَّاک، ابن زید اور دوسرے مفسرین اس سے مراد وہ بیتِ معمور لیتے ہیں جس کا ذکر معراج کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، جس کی دیوار سے آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ٹیک لگائے دیکھا تھا۔ مجاہد، قَتَادہ اور ابن زید کہتے ہیں کہ جس طرح خانۂ کعبہ اہلِ زمین کے لیے خدا پرستوں کا مرکز و مرجع ہے اُسی طرح ہر آسمان میں اُس کے باشندوں کے لیے ایسا ہی ایک کعبہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے

ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ وہ اس روز واقع ہوگا جب آسمان بُری طرح ڈگمگائے گا

والوں کے لیے ایسی ہی مرکزیت رکھتا ہے۔ انہی میں سے ایک کعبہ وہ تھا جس کی دیوار سے ٹیک لگائے حضرت ابراہیم علیہ السلام معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آئے تھے، اور اُس سے حضرت ابراہیمؑ کی مناسبت فطری تھی کیونکہ آپ ہی زمین والے کعبہ کے بانی ہیں۔ اِس تشریح کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ دوسری تفسیر حضرت حسن بصری کی تفسیر کے خلاف نہیں پڑتی، بلکہ دونوں کو ملا کر ہم یُوں سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں قسم صرف زمین ہی کے کعبہ کی نہیں کھائی گئی ہے بلکہ اس میں اُن تمام کعبوں کی قسم بھی شامل ہے جو ساری کائنات میں موجود ہیں۔

ﷺ اونچی چھت سے مراد آسمان ہے جو زمین پر ایک قُبّے کی طرح چھایا ہُوا نظر آتا ہے۔ اور یہاں یہ لفظ پُورے عالمِ بالا کے لیے استعمال ہُوا ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ قٓ، حاشیہ نمبر ۷)۔

ﷺ اصل میں لفظ البحر المسجور استعمال ہُوا ہے۔ اس کے متعدد معنی بیان کیے گئے ہیں بعض مفسّرین نے اس کو "آگ سے بھرے ہوئے" کے معنی میں لیا ہے۔ بعض اس کو فارغ اور خالی کے معنی میں لیتے ہیں جس کا پانی زمین میں اُتر کر غائب ہو گیا ہو۔ بعض اسے محبوس کے معنی میں لیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ سمندر کو روک کر رکھا گیا ہے تاکہ اس کا پانی زمین میں اُتر کر غائب بھی نہ ہو جائے، اور خشکی پر چھا بھی نہ جائے کہ زمین کے سب باشندے اس میں غرق ہو جائیں۔ بعض اسے مخلوط کے معنی میں لیتے ہیں جس کے اندر میٹھا اور کھاری، گرم اور سرد ہر طرح کا پانی آکر مل جاتا ہے۔ اور بعض اس کو لبریز اور موجزن کے معنی میں لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو معنی تو موقع و محل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ سمندر کی یہ دونوں کیفیات کہ اُس کی تہ پھٹ کر اُس کا پانی زمین کے اندر اُتر جائے اور وہ آگ سے بھر جائے، قیامت کے وقت ظاہر ہوں گی، جیسا کہ سورۂ تکویر آیت ۶، اور سورۂ انفطار آیت ۳ میں بیان ہُوا ہے۔ یہ آئندہ رونما ہونے والی کیفیات اِس وقت موجود نہیں ہیں کہ اُن کی قسم کھا کر آج کے لوگوں کو آخرت کے وقوع کا یقین دلایا جائے۔ اس لیے اِن دو معنوں کو ساقط کر کے یہاں البحر المسجور کو محبوس، مخلوط، اور لبریز و موجزن کے معنی ہی میں لیا جا سکتا ہے۔

ﷺ یہ ہے وہ حقیقت جس پر ان پانچ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ رب کے عذاب سے مراد آخرت

ہے۔ چونکہ یہاں اُس پر ایمان لانے والے مخاطب نہیں ہیں بلکہ اُس کا انکار کرنے والے مخاطب ہیں، اور اُن کے حق میں اُس کا آنا عذاب ہی ہے، اس لیے اُس کو قیامت یا آخرت یا روزِ جزا کہنے کے بجائے "رب کا عذاب" کہا گیا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس کے وقوع پر وہ پانچ چیزیں کس طرح دلالت کرتی ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے۔

طور وہ جگہ ہے جہاں ایک دبی اور پسی ہوئی قوم کو اٹھانے اور ایک غالب و قاہر قوم کو گرانے کا فیصلہ کیا گیا، اور یہ فیصلہ قانونِ طبیعی (PHYSICAL LAW) کی بنیاد پر نہیں بلکہ قانونِ اخلاقی (MORAL LAW) اور قانونِ مکافات (LAW OF RETRIBUTION) کی بنیاد پر تھا۔ اس لیے آخرت کے حق میں تاریخی استدلال کے طور پر طُور کو بطورِ ایک علامت کے پیش کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل جیسی ایک بے بس قوم کا اٹھایا جانا اور فرعون جیسے ایک زبردست فرمانروا کا اپنے لشکروں سمیت غرق کر دیا جانا، جس کا فیصلہ ایک سُنسان رات میں کوہ طُور پر کیا گیا تھا، انسانی تاریخ میں اس امر کی ایک نمایاں ترین مثال ہے کہ سلطنتِ کائنات کا مزاج کس طرح انسان جیسی ایک ذی عقل و ذی اختیار مخلوق کے معاملہ میں اخلاقی محاسبے اور جزائے اعمال کا تقاضا کرتا ہے، اور اس تقاضے کی تکمیل کے لیے ایک ایسا یوم الحساب ضروری ہے جس میں پوری نوعِ انسانی کو اکٹھا کر کے اس کا محاسبہ کیا جائے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن تفسیر سورۂ ذاریات، حاشیہ ۲۱)۔

کتبِ مقدسہ کے مجموعے کی قسم اس بنا پر کھائی گئی ہے کہ خداوندِ عالم کی طرف سے دنیا میں جتنے بھی انبیاء آئے اور جو کتابیں بھی وہ لائے، اُن سب نے ہر زمانے میں وہی ایک خبر دی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، یعنی یہ کہ تمام اگلے پچھلے انسانوں کو ایک دن از سرِ نو زندہ ہو کر اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا اور سزا پانی ہے۔ کوئی کتابِ آسمانی کبھی ایسی نہیں آئی ہے جو اس خبر سے خالی ہو، یا جس نے انسان کو اُلٹی یہ اطلاع دی ہو کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اور انسان بس مر کر مٹی ہو جانے والا ہے جس کے بعد نہ کوئی حساب ہے نہ کتاب۔

بیتِ معمور کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ خاص طور پر اہلِ عرب کے لیے اُس زمانے میں خانۂ کعبہ کی عمارت ایک ایسی کھُلی نشانی تھی جو اللہ کے پیغمبروں کی صداقت پر اور اس حقیقت پر کہ اللہ جل شانہ کی حکمتِ بالغہ

وقدرتِ قاہرہ اُن کی پُشت پر ہے، صریح شہادت دے رہی تھی۔ اِن آیات کے نزول سے ڈھائی ہزار برس پہلے بے آب و گیاہ اور غیر آباد پہاڑوں میں ایک شخص کسی لاؤ لشکر اور سروسامان کے بغیر آتا ہے اور اپنی ایک بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو بالکل بے سہارا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پھر کچھ مدت بعد وہی شخص آکر اس سُنسان جگہ پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ایک گھر بناتا ہے اور پکار دیتا ہے کہ لوگو، آؤ اور اس گھر کا حج کیا کرو۔ اِس تعمیر اور اِس پکار کو یہ حیرت انگیز مقبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہی گھر تمام اہل عرب کا مرکز بن جاتا ہے، اُس پکار پر عرب کے ہر گوشے سے لوگ لبیک لبیک کہتے ہوئے کھچے چلے آتے ہیں، ڈھائی ہزار برس تک یہ گھر ایسا امن کا گہوارہ بنا رہتا ہے کہ اس کے گرد و پیش سارے ملک میں کشت و خون کا بازار گرم ہوتا ہے مگر اس کے حدود میں آکر کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی، اور اسی گھر کی بدولت عرب کو ہر سال چار مہینے ایسے امن کے میسر آجاتے ہیں جن میں قافلے اطمینان سے سفر کرتے ہیں، تجارت چمکتی ہے اور بازار لگتے ہیں۔ پھر اُس گھر کا یہ دبدبہ تھا کہ اس پوری مدت میں کوئی بڑے سے بڑا جبّار بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکا، اور جس نے یہ جرأت کی وہ اللہ کے غضب کا ایسا شکار ہوا کہ عبرت بن کر رہ گیا۔ یہ کرشمہ ان آیات کے نزول سے صرف ۴۵ ہی برس پہلے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور اس کے دیکھنے والے بہت سے آدمی اُس وقت مکّہ معظمہ میں زندہ موجود تھے جب یہ آیات اہلِ مکّہ کو سنائی جا رہی تھیں۔ اس سے بڑھ کر کیا چیز اس بات کی دلیل ہو سکتی تھی کہ خدا کے پیغمبر ہوائی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اُن کی آنکھیں وہ کچھ دیکھتی ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔ اُن کی زبان پر وہ حقائق جاری ہوتے ہیں جن تک دوسروں کی عقل نہیں پہنچ سکتی وہ بظاہر ایسے کام کرتے ہیں جن کو ایک وقت کے لوگ دیکھیں تو دیوانگی سمجھیں اور صدیوں بعد کے لوگ انہی کو دیکھ کر ان کی بصیرت پر دنگ رہ جائیں۔ اس شان کے لوگ جب بالاتفاق ہر زمانے میں یہ خبر دیتے رہے ہیں کہ قیامت آئے گی اور حشر و نشر ہو گا تو اِسے دیوانوں کی بڑ سمجھنا خود دیوانگی ہے۔

اُونچی چھت (آسمان)، اور موجزن سمندر کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی حکمت اور اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں اور اسی حکمت و قدرت سے آخرت کا امکان بھی ثابت ہوتا ہے اور اس کا وقوع و وجوب بھی۔ آسمان کی دلالت پر ہم اس سے پہلے تفسیر سورۂ ق حاشیہ ۷ میں کلام کر چکے ہیں۔ رہا سمندر، تو جو شخص

بھی انکار کا پختگی فیصلہ کیے بغیر اُس کو نگاہِ غور سے دیکھے گا اس کا دل یہ گواہی دیگا کہ زمین پر پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کا فراہم ہو جانا بجائے خود ایک ایسی کاریگری ہے جو کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ پھر اُس کے ساتھ اتنی بے شمار حکمتیں وابستہ ہیں کہ اتفاقاً ایسا حکیمانہ نظام قائم ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اس میں بے حدو حساب حیوانات پیدا کیے گئے ہیں جن میں سے ہر نوع کا نظامِ جسمانی ٹھیک اُس گہرائی کے لیے موزوں بنایا گیا ہے جس کے اندر اُسے رہنا ہے۔ اس کے پانی کو نمکین بنا دیا گیا ہے تاکہ روزانہ کروڑوں جانور جو اس میں مرتے ہیں اُن کی لاشیں سڑ نہ جائیں۔ اس کے پانی کو ایک خاص حد پر اس طرح روک رکھا گیا ہے کہ نہ تو وہ زمین کے شگافوں سے گزر کر اس کے پیٹ میں اُتر جاتا ہے اور نہ خشکی پر چڑھ کر اسے غرق کر دیتا ہے، بلکہ لاکھوں کروڑوں برس سے وہ اسی حد پر رکا ہوا ہے۔ اسی عظیم ذخیرۂ آب کے موجود اور برقرار رہنے سے زمین کے خشک حصّوں پر بارش کا انتظام ہوتا ہے جس میں سورج کی گرمی اور ہواؤں کی گردش اس کے ساتھ پوری باقاعدگی کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ اسی کے غیر آباد نہ ہونے اور طرح طرح کی مخلوقات اس میں پیدا ہونے سے یہ فائدہ حاصل ہوا ہے کہ انسان اس سے اپنی غذا اور اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں کثیر مقدار میں حاصل کر رہا ہے۔ اسی کے ایک حد پر رُکے رہنے سے وہ براعظم اور جزیرے قائم ہیں جن پر انسان بس رہا ہے۔ اور اسی کے چند اٹل قواعد کی پابندی کرنے سے یہ ممکن ہوا ہے کہ انسان اس میں جہاز رانی کر سکے۔ ایک حکیم کی حکمت اور ایک قادرِ مطلق کی زبردست قدرت کے بغیر اس انتظام کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے مفاد سے سمندر کے اِس انتظام کا یہ گہرا تعلق بس الل ٹپ ہی قائم ہو گیا ہے۔ اب اگر فی الواقع یہ اس امر کی ناقابلِ انکار شہادت ہے کہ ایک خدائے حکیم و قادر نے انسان کو زمین پر آباد کرنے کے لیے دوسرے بے شمار انتظامات کے ساتھ یہ بحرِ شور بھی اِس شان کا پیدا کیا، تو وہ شخص سخت احمق ہو گا جو اُس حکیم سے اِس نادانی کی توقع رکھے کہ وہ اِس سمندر سے انسان کی کھیتیاں سیراب کرنے اور اس کے ذریعہ سے انسان کو رزق دینے کا انتظام تو کر دے گا مگر اس سے کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ تو نے میرا رزق کھا کر اُس کا حق کیسے ادا کیا، اور وہ اِس سمندر کے سینے پر اپنے جہاز دوڑانے کی قدرت تو انسان کو عطا کر دے گا مگر اُس سے کبھی یہ نہ پوچھے گا کہ یہ جہاز تو نے حق اور راستی کے ساتھ دوڑائے تھے یا اِن کے ذریعے سے دنیا میں ڈاکے مارتا پھرتا

اور پہاڑ اُڑے اُڑے پھریں گے۔[۸] تباہی ہے اُس روز اُن جھٹلانے والوں کے لیے جو آج کھیل کے طور پر اپنی حجت بازیوں میں لگے ہوئے ہیں۔[۹] جس دن انہیں دھکّے مار مار کر نارِ جہنم کی طرف لے چلا جائے گا اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ "یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے، اب بتاؤ،

تھا۔ اِسی طرح یہ تصوّر کرنا بھی ایک بہت بڑی کند ذہنی ہے کہ جس قادرِ مطلق کی قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ اِس عظیم الشان سمندر کی تخلیق ہے، جس نے فضا میں گھومنے والے اِس معلّق کرّے پر پانی کے اتنے بڑے ذخیرے کو تھام رکھا ہے، جس نے نمک کی اتنی بڑی مقدار اِس میں گھول دی ہے، جس نے طرح طرح کی اَن گنت مخلوقات اس میں پیدا کی ہیں اور ان سب کی رزق رسانی کا انتظام اِسی کے اندر کر دیا ہے، جو ہر سال اربوں ٹن پانی اِس میں سے اٹھا کر ہوا کے دوش پر لے جاتا ہے اور کروڑوں مربع میل کے خشک علاقوں پر اُسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ برساتا رہتا ہے، وہ انسان کو ایک دفعہ پیدا کر دینے کے بعد ایسا عاجز ہو جاتا ہے کہ پھر اُسے پیدا کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔

[۷] اصل الفاظ ہیں تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا۔ مَور عربی زبان میں گھومنے، اَونٹنے، پھڑکنے، جھوم جھوم کر چلنے، چکّر کھانے اور بار بار آگے پیچھے حرکت کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ قیامت کے دن آسمان کی جو حالت ہوگی اسے اِن الفاظ میں بیان کر کے یہ تصوّر دلایا گیا ہے کہ اُس روز عالَمِ بالا کا سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا اور دیکھنے والا جب آسمان کی طرف دیکھے گا تو اُسے یُوں محسوس ہوگا کہ وہ جما جمایا نقشہ جو ہمیشہ ایک ہی شان سے نظر آتا تھا، بگڑ چکا ہے اور ہر طرف ایک اضطراب برپا ہے۔

[۸] دوسرے الفاظ میں زمین کی وہ گرفت جس نے پہاڑوں کو جما رکھا ہے، ڈھیلی پڑ جائے گی اور وہ اپنی جڑوں سے اکھڑ کر فضا میں اس طرح اُڑنے لگیں گے جیسے بادل اُڑے پھرتے ہیں۔

[۹] مطلب یہ ہے کہ نبی سے قیامت اور آخرت اور جنت و دوزخ کی خبریں سُن کر انہیں نداق کا موضوع بنا رہے ہیں اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرنے کے بجائے محض تفریحًا ان پر باتیں چھانٹ رہے ہیں۔ آخرت پر ان کی بحثوں کا مقصود حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں ہے، بلکہ ایک کھیل ہے جس سے یہ دل بہلاتے ہیں اور انہیں کچھ ہوش نہیں ہے کہ فی الواقع یہ کس انجام کی طرف چلے جا رہے ہیں۔

یہ جادو ہے یا تمہیں سوجھ نہیں رہا ہے[۱۰]؟ جاؤ اب جھلسو اس کے اندر، تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے یکساں ہے، تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔"

متقی لوگ[۱۱] وہاں باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے، لطف لے رہے ہوں گے اُن چیزوں سے جو اُن کا رب انہیں دے گا، اور اُن کا رب اُنہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے گا[۱۲]۔ (ان سے کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو مزے سے[۱۳] اپنے اُن اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ آمنے سامنے بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں اُن سے بیاہ دیں گے[۱۴]۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اُن کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں ان کے نقشِ قدم

---

[۱۰] یعنی دنیا میں جب رسول تمہیں اِس جہنم کے عذاب سے ڈراتے تھے تو تم کہتے تھے کہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے جس سے ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ اب بولو، یہ جہنم جو تمہارے سامنے ہے یہ اُسی جادو کا کرشمہ ہے یا اب بھی تمہیں نہ سوجھا کہ واقعی اسی جہنم سے تمہارا پالا پڑ گیا ہے جس کی خبر تمہیں دی جا رہی تھی؟

[۱۱] یعنی وہ لوگ جنہوں نے انبیاء کی دی ہوئی خبر پر ایمان لا کر دنیا ہی میں اپنا بچاؤ کر لیا اور اُن افکار و اعمال سے پرہیز کیا جن سے انسان جہنم کا مستحق بنتا ہے۔

[۱۲] کسی شخص کے داخلِ جنت ہونے کا ذکر کر دینے کے بعد پھر دوزخ سے اس کے بچائے جانے کا ذکر کرنے کی بظاہر کوئی حاجت نہیں رہتی۔ مگر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ دونوں باتیں الگ الگ اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ آدمی کا دوزخ سے بچ جانا بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اور یہ ارشاد کہ "اللہ نے ان کو عذابِ دوزخ سے بچا لیا" دراصل اشارہ ہے اِس حقیقت کی طرف کہ آدمی کا دوزخ سے بچ جانا اللہ کے فضل و کرم ہی سے ممکن ہے، ورنہ بشری کمزوریاں ہر شخص کے عمل میں ایسی ایسی خامیاں پیدا کر دیتی ہیں کہ اگر اللہ اپنی فیاضی سے ان کو نظر انداز نہ فرمائے اور سخت محاسبے پر اتر آئے تو کوئی بھی گرفت سے نہیں چھوٹ سکتا۔ اسی لیے جنت میں داخل ہونا اللہ کی جتنی بڑی نعمت ہے اس سے کچھ کم نعمت یہ نہیں ہے کہ آدمی دوزخ سے بچا لیا جائے۔

[۱۳] یہاں "مزے سے" کا لفظ اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ جنت میں انسان کو جو کچھ ملے گا

پر چلی ہے ان کی اُس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) اُن کے ساتھ ملا دیں گے اور اُن کے عمل میں کوئی گھاٹا اُن کو نہ دیں گے۔[۱۵] ہر شخص اپنے کسب کے عوض رہن ہے۔[۱۶] ہم اُن کو ہر طرح کے پھل اور

کسی مشقت اور محنت کے بغیر ملے گا۔ اس کے ختم ہو جانے یا اس کے اندر کمی واقع ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہو گا۔ اس کے لیے انسان کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔ وہ عین اس کی خواہش اور اس کے دل کی پسند کے مطابق ہو گا۔ جتنا چاہے گا اور جب چاہے گا حاضر کر دیا جائے گا۔ مہمان کے طور پر وہ وہاں مقیم نہ ہو گا کہ کچھ طلب کرتے ہوئے شرماتے بلکہ سب کچھ اس کے اپنے گذشتہ اعمال کا صلہ اور اس کی اپنی پچھلی کمائی کا ثمرہ ہو گا۔ اس کے کھانے اور پینے سے کسی مرض کا خطرہ بھی نہ ہو گا۔ وہ بھوک مٹانے اور زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ صرف لذت حاصل کرنے کے لیے ہو گا اور آدمی جتنی لذت بھی اُس سے اٹھانا چاہے، اٹھا سکے گا بغیر اس کے کہ اس سے کوئی سوءِ ہضم لاحق ہو۔ اور وہ غذا کسی قسم کی غلاظت پیدا کرنے والی بھی نہ ہو گی۔ اس لیے دنیا میں "مزے سے" کھانے پینے کا جو مفہوم ہے، جنت میں مزے سے کھانے پینے کا مفہوم اس سے بدرجہا زیادہ وسیع اور اعلیٰ وارفع ہے۔

۱۴؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، ص ۲۸۶ تا ۲۸۸-۵۰۲

۱۵؎ یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ رعد آیت ۲۳، اور سورۂ مومن آیت ۸ میں بھی گزر چکا ہے، مگر یہاں اُن دونوں مقامات سے بھی زیادہ ایک بڑی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ سورۂ رعد والی آیت میں صرف اتنی بات فرمائی گئی تھی کہ اہلِ جنت کے آبا و اجداد اور ان کی اولاد اور ان کی بیویوں میں سے جو جو افراد بھی صالح ہوں گے وہ سب ان کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور سورۂ مومن میں ارشاد ہوا تھا کہ فرشتے اہلِ ایمان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ جو صالح ہوں انہیں بھی جنت میں ان سے ملا دے۔ یہاں ان دونوں آیتوں سے زائد جو بات فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اولاد کسی نہ کسی درجۂ ایمان میں بھی اپنے آباء کے نقشِ قدم کی پیروی کرتی رہی ہو، تو خواہ اپنے عمل کے لحاظ سے وہ اُس مرتبے کی مستحق نہ ہو جو آباء کو اُن کے بہتر ایمان و عمل کی

بنا پر حاصل ہو گا، پھر بھی یہ اولاد اپنے آباء کے ساتھ ملا دی جائے گی۔ اور یہ ملانا اُس نوعیت کا نہ ہو گا جیسے وقتاً فوقتاً کوئی کسی سے جا کر ملاقات کر لیا کرے، بلکہ اس کے لیے اَلْحَقْنَا بِهِمْ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے معنی یہ ہیں کہ وہ جنت میں اُن کے ساتھ ہی رکھے جائیں گے۔ اس پر مزید یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ اولاد سے ملانے کے لیے آباء کا درجہ گھٹا کر انہیں نیچے نہیں اتارا جائے گا، بلکہ آباء سے ملانے کے لیے اولاد کا درجہ بڑھا کر انہیں اُوپر پہنچا دیا جائے گا۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ یہ ارشاد اُس بالغ اولاد کے بارے میں ہے جس نے سنِ رُشد کو پہنچ کر اپنے اختیار اور ارادے سے ایمان لانے کا فیصلہ کیا ہو اور جو اپنی مرضی سے اپنے صالح بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلی ہو۔ رہی ایک مومن کی وہ اولاد جو سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے ہی مر گئی ہو تو اس کے معاملہ میں کفر و ایمان اور طاعت و معصیت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُسے تو ویسے ہی جنت میں جانا ہے اور اس کے آباء کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے انہی کے ساتھ رکھا جانا ہے۔

۱۶ یہاں "رہن" کا استعارہ بہت معنی خیز ہے۔ ایک شخص اگر کسی سے کچھ قرض لے اور قرض دینے والا اپنے حق کی ادائیگی کے لیے ضمانت کے طور پر اس کی کوئی چیز اپنے پاس رہن رکھ لے تو جب تک وہ قرض ادا نہ کر دے اس وقت تک فکِ رہن نہیں ہو سکتا، اور اگر مدتِ مقررہ گزر جانے پر بھی وہ فکِ رہن نہ کر لے تو شئے مرہونہ ضبط ہو جاتی ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان معاملہ کی نوعیت کو یہاں اسی صورتِ معاملہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ خدا نے انسان کو جو سروسامان، جو طاقتیں اور صلاحیتیں اور جو اختیارات دنیا میں عطا کیے ہیں وہ گویا ایک قرض ہے جو مالک نے اپنے بندے کو دیا ہے، اور اس قرض کی ضمانت کے طور پر بندے کا نفس خدا کے پاس رہن ہے۔ بندہ اِس سروسامان اور ان قوتوں اور اختیارات کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے اگر وہ نیکیاں کمائے جن سے یہ قرض ادا ہو سکتا ہو تو وہ شئے مرہونہ یعنی اپنے نفس کو چھڑا لے گا، ورنہ اسے ضبط کر لیا جائے گا۔ پچھلی آیت کے معاً بعد یہ بات اس لیے ارشاد فرمائی گئی ہے کہ مومنین صالحین خواہ بجائے خود کتنے ہی بڑے مرتبے کے لوگ ہوں، ان کی اولاد کا فکِ رہن اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ وہ خود اپنے کسب سے اپنے نفس کو چھڑائے۔ باپ دادا کی کمائی

گوشت [۱۷] جس چیز کو بھی ان کا جی چاہے گا، خوب دیئے چلے جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے جامِ شراب لپک لپک کر لے رہے ہوں گے جس میں نہ یاوہ گوئی ہوگی نہ بدکرداری [۱۸]۔ اور اُن کی خدمت

اولاد کو نہیں چھڑا سکتی۔ البتہ اولاد اگر کسی درجے کے ایمان اور اتباعِ صالحین سے بھی اپنے آپ کو چھڑانے جائے تو پھر یہ اللہ کا فضل اور اس کا کرم ہے کہ جنت میں وہ اس کو نیچے کے مرتبوں سے اٹھا کر اونچے مراتب میں باپ دادا کے ساتھ لے جا کر ملا دے۔ باپ دادا کی نیکیوں کا یہ فائدہ تو اولاد کو مل سکتا ہے، لیکن اگر وہ اپنے کسب سے اپنے آپ کو دوزخ کا مستحق بنا لے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ باپ دادا کی خاطر اسے جنت میں پہنچا دیا جاتے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اس آیت سے نکلتی ہے کہ کم درجے کی نیک اولاد کا بڑے درجے کے نیک آباد سے لے جا کر ملا دیا جانا دراصل اُس اولاد کے کسب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اُن آباد کے کسب کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے عمل سے اس فضل کے مستحق ہونگے کہ ان کے دل خوش کرنے کے لیے ان کی اولاد کو ان سے لا ملایا جائے۔ اسی وجہ سے اللہ ان کے درجے گھٹا کر انہیں اولاد کے پاس نہیں لے جائے گا بلکہ اولاد کے درجے بڑھا کر اُن کے پاس لے جائے گا، تاکہ اُن پر خدا کی نعمتوں کے اتمام میں یہ کسر باقی نہ رہ جائے کہ اپنی اولاد سے دُوری ان کے لیے باعثِ اذیت ہو۔

[۱۷] اس آیت میں اہلِ جنت کو مطلقاً ہر قسم کا گوشت دیئے جانے کا ذکر ہے، اور سورۂ واقعہ آیت ۲۱ میں فرمایا گیا ہے کہ پرندوں کے گوشت سے ان کی تواضع کی جائے گی۔ اس گوشت کی نوعیت ہمیں ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہے۔ مگر جس طرح قرآن کی بعض تصریحات اور بعض احادیث میں جنت کے دودھ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ جانوروں کے تھنوں سے نکلا ہوا نہ ہوگا، اور جنت کے شہد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ مکھیوں کا بنایا ہوا نہ ہوگا، اور جنت کی شراب کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ پھلوں کو سڑا کر کشید کی ہوئی نہ ہوگی، بلکہ اللہ کی قدرت سے یہ چیزیں چشموں سے نکلیں گی اور نہروں میں بہیں گی، اس سے یہ قیاس

میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہونگے جو انہی کے لیے مخصوص ہوں گے،[19] ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے (دنیا میں گزرے ہوئے) حالات پوچھیں گے۔ یہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے،[20] آخرکار

کیا جا سکتا ہے کہ جنت کا گوشت بھی جانوروں کا ذبیحہ نہ ہوگا بلکہ یہ بھی قدرتی طور پر پیدا ہوگا۔ جو خدا زمین کے مادوں سے براہِ راست دودھ اور شہد اور شراب پیدا کر سکتا ہے اس کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ انہی مادوں سے ہر طرح کا لذیذ ترین گوشت پیدا کر دے جو جانوروں کے گوشت سے بھی اپنی لذت میں بڑھ کر ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۵۔ تفسیر سورہ محمد، حواشی ۲۱ تا ۲۳)

۱۸؎ یعنی وہ شراب نشہ پیدا کرنے والی نہ ہوگی کہ اسے پی کر وہ بدمست ہوں اور بیہودہ بکواس کرنے لگیں، یا گالم گلوچ اور دھول دھپے پر اتر آئیں، یا اُس طرح کی فحش حرکات کرنے لگیں جیسی دنیا کی شراب پینے والے کرتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۷)

۱۹؎ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ غِلْمَانُهُمْ نہیں فرمایا بلکہ غِلْمَانٌ لَّهُمْ فرمایا ہے۔ اگر غلمانہم فرمایا جاتا تو اس سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ دنیا میں اُن کے جو خادم تھے وہی جنت میں بھی ان کے خادم بنا دیے جائیں گے، حالانکہ دنیا کا جو شخص بھی جنت میں جائے گا اپنے استحقاق کی بنا پر جائے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ جنت میں پہنچ کر وہ اپنے اُسی آقا کا خادم بنا دیا جائے جس کی خدمت وہ دنیا میں کرتا رہا تھا۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی خادم اپنے عمل کی وجہ سے اپنے مخدوم کی بہ نسبت زیادہ بلند مرتبہ جنت میں پائے۔ اِس لیے غِلْمَانٌ لَّهُمْ فرما کر اِس گمان کی گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی۔ یہ لفظ اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ یہ وہ لڑکے ہونگے جو جنت میں اُن کی خدمت کے لیے مخصوص کر دیے جائیں گے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۶)

۲۰؎ یعنی ہم وہاں عیش میں منہمک اور اپنی دنیا میں مگن ہو کر غفلت کی زندگی نہیں گزار رہے تھے، بلکہ ہر وقت ہمیں یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ہم سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جس پر خدا کے ہاں ہماری پکڑ ہو جائے

اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا[۲۱] کے عذاب سے بچا لیا۔ ہم پچھلی زندگی میں اُسی سے
ع دعائیں مانگتے تھے، وہ واقعی بڑا ہی محسن اور رحیم ہے ۔ع
پس اے نبیؐ، تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔[۲۲]

خاص طور پر اپنے گھر والوں کے درمیان ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جس وجہ سے گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے بال بچوں کو عیش کرانے اور ان کی دنیا بنانے کی فکر ہے۔ اسی کے لیے وہ حرام کماتا ہے، دوسروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتا ہے، اور طرح طرح کی ناجائز تدبیریں کرتا ہے۔ اسی بنا پر اہلِ جنت آپس میں کہیں گے کہ خاص طور پر جس چیز نے ہمیں عاقبت کی خرابی سے بچایا وہ یہ تھی کہ اپنے بال بچوں میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں ان کو عیش کرانے اور ان کا مستقبل شاندار بنانے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس بات کی تھی کہ ہم اُن کی خاطر وہ طریقے نہ اختیار کر بیٹھیں جن سے ہماری آخرت برباد ہو جائے، اور اپنی اولاد کو بھی ایسے راستے پر نہ ڈال جائیں جو ان کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنا دے۔

۲۱؎ اصل میں لفظ سَمُوم استعمال ہوا ہے جس کے معنی سخت گرم ہوا کے ہیں۔ اس سے مراد لُو کی وہ لپٹیں ہیں جو دوزخ سے اُٹھ رہی ہوں گی۔

۲۲؎ اوپر آخرت کی تصویر پیش کرنے کے بعد اب تقریر کا رُخ کفارِ مکہ کی اُن ہٹ دھرمیوں کی طرف پھر رہا ہے جن سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہاں خطاب بظاہر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل آپ کے واسطے سے یہ باتیں کفارِ مکہ کو سنانی مقصود ہیں۔ اُن کے سامنے جب آپ قیامت، اور حشر و نشر، اور حساب و کتاب، اور جزا و سزا، اور جنت و جہنم کی باتیں کرتے تھے، اور ان مضامین پر مشتمل قرآن مجید کی آیات اس دعوے کے ساتھ اُن کو سناتے تھے کہ یہ خبریں اللہ کی طرف سے میرے پاس آئی ہیں اور یہ اللہ کا کلام ہے جو مجھ پر وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے، تو اُن کے سردار اور مذہبی پیشوا اور آوارہ باش لوگ آپ کی ان باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ نہ خود غور کرتے تھے، نہ یہ چاہتے تھے کہ عوام ان کی طرف توجہ کریں۔ اس لیے وہ آپ کے اوپر کبھی یہ فقرہ کستے تھے کہ آپ کاہن ہیں، اور کبھی یہ کہ آپ مجنون ہیں، اور کبھی یہ کہ آپ شاعر ہیں، اور کبھی یہ کہ آپ خود اپنے دل سے یہ نرالی باتیں گھڑتے ہیں

اور محض اپنا رنگ جمانے کے لیے اِنہیں خدا کی نازل کردہ وحی کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ اس طرح کے فقرے کس کر وہ لوگوں کو آپ کی طرف سے بدگمان کردیں گے اور آپ کی ساری باتیں ہوا میں اڑ جائیں گی۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اَے نبی، واقعی حقیقت تو وہی کچھ ہے جو سُورۃ کے آغاز سے یہاں تک بیان کی گئی ہے۔ اب اگر یہ لوگ اِن باتوں پر تمہیں کاہن اور مجنون کہتے ہیں تو پروا نہ کرو اور بندگانِ خدا کو غفلت سے چونکانے اور حقیقت سے خبردار کرنے کا کام کرتے چلے جاؤ، کیونکہ خدا کے فضل سے نہ تم کاہن ہو نہ مجنون۔

"کاہن" عربی زبان میں جوتشی، غیب گو اور سیانے کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا۔ کاہنوں کا دعویٰ تھا، اور اُن کے بارے میں ضعیف الاعتقاد لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ ستارہ شناس ہیں، یا ارواح اور شیاطین اور جنوں سے ان کا خاص تعلق ہے جس کی بدولت وہ غیب کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز کھوئی جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ کوئی اپنی قسمت پوچھے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اِنہی اغراض کے لیے لوگ اُن کے پاس جاتے تھے اور وہ کچھ نذر نیاز لے کر انہیں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بسا اوقات بستیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے تاکہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں۔ ان کی ایک خاص وضع قطع ہوتی تھی جس سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ ان کی زبان بھی عام بول چال سے مختلف ہوتی تھی۔ وہ مقفّیٰ اور مسجّع فقرے خاص لہجے میں ذرا ترنم کے ساتھ بولتے تھے اور بالعموم ایسے گول مول فقرے استعمال کرتے تھے جن سے ہر شخص اپنے مطلب کی بات نکال لے۔ قریش کے سرداروں نے عوام کو فریب دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کاہن ہونے کا الزام صرف اِس بنا پر لگا دیا کہ آپ اُن حقائق کی خبر دے رہے تھے جو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں، اور آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کی طرف سے ایک فرشتہ آکر آپ پر وحی نازل کرتا ہے، اور خدا کا جو کلام آپ پیش کر رہے تھے وہ بھی مقفّیٰ تھا لیکن عرب میں کوئی شخص بھی اُن کے اِس الزام سے دھوکا نہ کھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ کاہنوں کے پیشے اور ان کی وضع قطع اور ان کی زبان

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردشِ ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟[۲۳]
ان سے کہو اچھا، انتظار کرو، مَیں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں[۲۴]۔ کیا اِن کی عقلیں انہیں

اور ان کے کاروبار سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، کس مقصد کے لیے لوگ ان کے پاس جاتے ہیں، کیا باتیں وہ ان کو بتاتے ہیں، اُن کے مُسجّع فقرے کیسے ہوتے ہیں اور کن مضامین پر وہ مشتمل ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی کاہن کا سرے سے یہ کام ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ قوم کے رائج الوقت عقائد کے خلاف ایک عقیدہ لے کر اٹھتا اور شب و روز اس کی تبلیغ میں اپنی جان کھپاتا اور اس کی خاطر ساری قوم کی دشمنی مول لیتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہانت کا یہ الزام برائے نام بھی کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا کہ یہ پھبتی آپ پر چسپاں ہو سکتی اور عرب کا کوئی کند ذہن سے کند ذہن آدمی بھی اس سے دھوکا کھا جاتا۔

اِسی طرح آپ پر جنون کا الزام بھی کفارِ مکہ محض اپنے دل کی تسلّی کے لیے لگاتے تھے جیسے موجودہ زمانے کے بعض بے شرم مغربی مصنّفین اسلام کے خلاف صرف اپنے بغض کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے یہ دعوے کرتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور پر صرع (EPILEPCY) کے دورے پڑتے تھے اور انہی دَوروں کی حالت میں جو کچھ آپ کی زبان سے نکلتا تھا اسے لوگ وحی سمجھتے تھے۔ ایسے بیہودہ الزامات کو کسی صاحبِ عقل آدمی نے نہ اُس زمانے میں قابلِ اعتنا سمجھا تھا، نہ آج کوئی شخص قرآن کو پڑھ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت و رہنمائی کے حیرت انگیز کارنامے دیکھ کر یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ صرع کے دَوروں کا کرشمہ ہے۔

۲۳؎ یعنی ہم منتظر ہیں کہ اس شخص پر کوئی آفت آئے اور کسی طرح اِس سے ہمارا پیچھا چھوٹے۔ غالباً اُن کا خیال یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمارے معبودوں کی مخالفت اور اُن کی کرامات کا انکار کرتے ہیں، اس لیے یا تو معاذ اللہ، اِن پر ہمارے کسی معبود کی مار پڑے گی، یا کوئی دل جلا اِن کی یہ باتیں سن کر آپے سے باہر ہو جائے گا اور انہیں قتل کر دے گا۔

۲۴؎ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تمہاری یہ آرزو پوری ہوتی ہے

ایسی ہی باتیں کرنے کے لیے کہتی ہیں ؟ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں ؟[۲۵]

یا نہیں - دوسرے یہ کہ میں بھی منتظر ہوں کہ شامت میری آتی ہے یا تمہاری۔

۲۵؎ اِن دو فقروں میں مخالفین کے سارے پروپیگنڈے کی ہوا نکال کر انہیں بالکل بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قریش کے سردار اور مشائخ بڑے عقلمند بنے پھرتے ہیں، مگر کیا ان کی عقل یہی کہتی ہے کہ جو شخص شاعر نہیں ہے اُسے شاعر کہو، جسے ساری قوم ایک دانا آدمی کی حیثیت سے جانتی ہے اُسے مجنون کہو، اور جس شخص کا کہانت سے کوئی دُور دراز کا تعلق بھی نہیں ہے اسے خواہ مخواہ کاہن قرار دو۔ پھر اگر عقل ہی کی بنا پر یہ لوگ حکم لگاتے تو کوئی ایک حکم لگاتے۔ بہت سے متضاد حکم تو ایک ساتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک شخص آخر بیک وقت شاعر، مجنون اور کاہن کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مجنون ہے تو نہ کاہن ہو سکتا ہے نہ شاعر۔ کاہن ہے تو شاعر نہیں ہو سکتا اور شاعر ہے تو کاہن نہیں ہو سکتا، کیونکہ شعر کی زبان اور اس کے موضوعات بحث الگ ہوتے ہیں اور کہانت کی زبان اور اس کے مضامین الگ۔ ایک ہی کلام کو بیک وقت شعر بھی کہنا اور کہانت بھی قرار دینا کسی ایسے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا جو شعر اور کہانت کا فرق جانتا ہو۔ پس یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں یہ متضاد باتیں عقل سے نہیں بلکہ سراسر ضد اور ہٹ دھرمی سے کی جا رہی ہیں، اور قوم کے یہ بڑے بڑے سردار عناد کے جوش میں اندھے ہو کر محض بے سروپا الزامات لگا رہے ہیں جنہیں کوئی سنجیدہ انسان قابلِ اعتنا نہیں سمجھ سکتا۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۱۴۷ تا ۱۴۹۔ جلد سوم، ص ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۴ تا ۵۴۸۔ جلد چہارم، ۲۷۰۔

ماضی کی ایک تجدّد پسند تحریک

المُعتَزِلہ

عبدالحمید صدیقی

دنیا کے نامور مصوّر ریفیل کی مصوری کا ایک نادر نمونہ مدرسہ ایتھنز (SCHOOL OF ATHENS) ہے۔ اس میں صاحب ذوق مصوّر کے ذہن رسا نے یونان کے دو مشہور فلاسفہ افلاطون اور ارسطو کے اساسی تصوّرات کے مابین واضح اختلاف کو اس تصویر میں یوں ظاہر کیا ہے کہ افلاطون چرخ نیلی فام کی طرف نگاہیں اٹھا کر اس عالم مادّی سے پرے حقیقتِ کبریٰ کا سُراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے برعکس ارسطو اپنی نظریں زمین پر گاڑ کر کائنات اور اس کے خالق کے وجود کا سراغ تلاش کرنے میں منہمک ہے۔ رب السمٰوات والارض چونکہ اس کائنات کی بنیادی اور بدیہی حقیقت ہے اس لیے ہر سوچنے والا دماغ اس کی نوعیت، اس کے مزاج اس کی صفات اور اس کے دائرۂ کار کو اپنی بساط کے مطابق متعین کرنے پر مجبور رہے۔ اسی بنا پر یونان کے ان دو نامور فلاسفہ نے بھی باری تعالیٰ کے متعلق مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کیں۔

خلافتِ عباسیہ کے آغاز ہی میں جب یونانی علوم و فنون عربی میں منتقل ہونے لگے تو ریاضی، منطق، طبیعیات کی طرح یونانی الٰہیات سے بھی عرب روشناس ہوئے۔ عربوں اور یونانیوں کے اس فکری اختلاط کا اثر مختلف صورتوں میں رونما ہوا۔ ایک طبقہ تو کتاب و سنّت کی تعلیمات سے پوری یکسوئی کے ساتھ وابستہ رہا اور اس نے یونانی افکار و نظریات کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی۔ دوسرے اللہ کے کچھ نیک بندوں نے اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس خوفناک طوفان کے بارے میں محض لاپروائی کا رویّہ اختیار کر کے زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ اگر اس کا بروقت مقابلہ نہ کیا گیا تو

اس کی یلغار اسلام کے سارے فکری اور عملی ڈھانچے کو برباد کر کے رکھ دے گی اس لیے انہوں نے یونانی علم الکلام کے مقابلے میں ایک ایسے علم الکلام کی بنیاد ڈالی جو اسلام کے مزاج اور اس کی روح کے زیادہ قریب تھا۔ اس گروہ میں یوں تو متعدد شخصیتیں شامل ہیں لیکن امام غزالیؒ، امام احمدؒ بن حنبل، ابن تیمیہؒ اور ان کے نامور شاگرد حافظ ابن قیمؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یونانی افکار کے اس سیلاب نے ایک تیسرے گروہ کو جنم دیا جسے تاریخ اسلام میں معتزلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ گروہ بڑے ذہین وفطین اور پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھا لیکن ان کے نظریات، ان کا طریقِ استدلال اور اس کے نتائج کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ یونانی علوم سے کافی حد تک مرعوب ہوا اور اسی ذہنی مرعوبیت کے تحت اُس نے اسلام کے بعض اساسی تصورات میں تغیر و تبدل کرنا شروع کیا۔ ان کی نیت اگرچہ نیک تھی کہ کسی طرح اسلامی افکار کو یونانی نظریات سے ہم آہنگ کر کے اسلام کی فکری برتری کو قائم رکھا جائے اور اس طرح عوام کے ایمان کو متزلزل ہونے سے بچایا جائے لیکن چونکہ اس تغیّر و تبدل کا اصل محرک ذہنی مرعوبیت تھی اس لیے معتزلہ نے غیر شعوری طور پر بعض ایسے یونانی افکار کو اپنا لیا جو اسلامی تعلیمات سے کسی طرح مطابقت نہ رکھتے تھے۔

معتزلہ پر چونکہ افلاطون کے افکار کے بجائے ارسطو کے تصورات کا زیادہ اثر تھا اس لیے ہم سب سے پہلے اُس کے الٰہیات کا ذکر کرتے ہیں۔ ارسطو کا خیال یہ تھا کہ دنیا کی ہر شے دو عناصر سے مرکب ہے۔ ایک اُس کا پیکرِ محسوس اور دوسرے وہ روح جو اس میں کارفرما ہے۔ یہ پیکرِ محسوس ہی اس کے وجود کی شہادت اور اس کی صفات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ارسطو کے اس نظریہ کو آپ ایک مثال سے سمجھیں۔ فرض کیجیے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا میں ایک کھیل فٹ بال بھی ہے۔ یہ چیز اپنی جگہ حقیقت ہے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ اس کھیل کا تصور فٹ بال کے کھلاڑیوں کے بغیر بھی کیا جا سکتا ہے تو یہ فضول سا تصور ہوگا۔ اسی طرح ہم مٹھاس کا اسی بنا پر تصور کرتے ہیں کہ دنیا میں میٹھی چیزیں موجود ہیں اور سُرخی اور سفیدی کا ہم اسی وجہ سے شعور رکھتے ہیں کہ دنیا میں بہت سی چیزیں رنگ کے اعتبار سے

سُرخ اور سفید ہمارے درمیان موجود ہیں۔[1]

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم سہی کہ سرخی کا تصوّر کسی شئے کے بغیر ممکن نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سُرخی کے تصوّر کے ساتھ کسی ایک متعیّن شئے یا چند مخصوص اشیاء کا تصوّر بھی ضروری ہو۔ سُرخی کا تصوّر کسی ایسی چیز کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جو سُرخ ہو۔ اس سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اصل حقیقت سُرخی ہے اور یہی مستقل اور پائیدار ہے۔ اسی کا تصوّر بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ باقی رہے وہ پیکرِ محسوس جن میں یہ جلوہ گر ہوتی ہے وہ سب اعتباری چیزیں ہیں۔

جب آپ پیکرِ محسوس کو اعتباری مان لیں تو پھر آپ خود بخود اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ "رُوح" کا خارجی جامہ اصل کے مقابلے میں نامکمل اور ناقص ہے کیونکہ اس میں مادّے کی کثافت موجود ہے۔

اسی اساسی نظریہ پر ارسطو نے باری تعالیٰ کے متعلق ایک تصوّر کی بنیاد رکھی۔ ارسطو کے نزدیک خداوند تعالیٰ ایک مکمل اور جامع تصور ہے۔ یہ کائنات جو خالق کی مظہر ہے نامکمل اور ناقص ہے اور اس کی حمد و ثنا کے ذوق اور اس کی محبت کے جوش میں ارتقاء اور ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ باری تعالیٰ اپنا کوئی مادی وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ علت العلل یا بنیادی علت ہے اس سے کائنات میں حرکت و نمو پیدا ہوتی ہے۔ ہم دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کے رنگا رنگ مظاہر اور اس کی حرکت کے پیچھے ایک ایسا تصوّر کارفرما ہے جو قدیم، قائم بالذات برحق اور سراپا نیکی ہے۔ یہی ارسطو کے نزدیک خدا کا صحیح تصوّر ہے۔[2]

یہی وہ مقام ہے جہاں ارسطو عیسائیت کے تصوّرِ باری تعالیٰ سے بھی شدید اختلاف کرتا ہے۔ اس کے فلسفے کے مطابق چونکہ سوائے خدا کے مجرّد تصوّر کے اور کوئی شئے قدیم نہیں بلکہ ساری اشیاء حادث ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات بھی حادث اور نامکمل ہیں اور ان سے ذاتِ برحق کے صحیح ادراک کے

---

[1] BURTRAND RUSSELL: HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

بجائے اس کے متعلق متعدد شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میں کوئی ایک صفت بھی ایسی نہیں جو انسانی صفات کے ساتھ قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہو۔ رسل نے اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے:

"ارسطو کے نزدیک باری تعالیٰ اُن صفات سے عاری ہے جن سے عیسائی بالعموم اس ذات برحق کو متصف کرتے ہیں کیونکہ اُس کی ذات کے علاوہ کسی چیز یا صفت کو اسی طرح مکمل سمجھنا خود اُس کے مکمل اور اکمل ہونے کی نفی کرتا ہے[1]۔"

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُسے مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ارسطو کے نزدیک:

- باری تعالیٰ مجرد تصور ہے۔
- وہ مستقل، قائم بالذات، برحق اور قدیم ہے۔
- وہ جانِ جہاں ہے اور ساری کائنات اسی کا مظہر ہے۔
- وہ اُن ساری صفات سے عاری ہے جن کی نسبت انسانوں کی طرف کی جاتی ہے۔ کیونکہ صفات حادث ہوتی ہیں اور ذاتِ حق قدیم ہے۔
- ذات باری نے دنیا کو پیدا کیا، اُسے حرکت دی۔ اسی بنا پر وہ اس پوری کائنات اور اس کی حرکت کی بنیادی علت ہے۔
- ساری کائنات اسی کی حمد و ثنا میں منہمک ہو کر اور اس کی محبت سے سرشار ہو کر ترقی کی منازل طے کر رہی ہے لیکن یہ ارتقاد اُسے کبھی بھی باری تعالیٰ کی طرح کامل نہیں بنا سکتا کیونکہ کائنات مادی وجود سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

مسلمانوں کے ہاں جب ان نظریات نے سرایت کرنی شروع کی تو وہ بھی ان سے شدید طور پر متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی وجود باری تعالیٰ کے متعلق ایک ایسا تصور پیش کیا جو ارسطو کے نظریات سے ملتا جلتا تھا۔

---

[1] BURTREND RUSSELL: HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY

آگے بڑھنے سے پیشتر یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا کے ہر گروہ نے جب بھی دنیا کے اندر کسی غلط تصور کو داخل کرنا چاہا تو اس نے سب سے پہلے عقل کی برتری اور اس کی فرمانروائی کا چرچا کیا اور یہ کہا کہ چونکہ مروجہ خیالات و افکار ذہن انسانی کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے اس لیے انہیں رد کر کے ان کی جگہ ایسے افکار و تصورات کو لانا ضروری ہے جو عقل کے عین مطابق ہوں عقل سے ان کی مراد وہ نظریات ہوتے ہیں جو اُس دَور کے غالب رجحانات کی عکاسی کریں۔

اسلام میں کئی ایک افراد اور گروہوں نے ان غالب رجحانات کے مطابق دین میں ترمیم و اضافے اور تغیر و تبدل کی مختلف اوقات میں مختلف کوششیں کیں۔ معتزلہ کا ان کوششوں میں بڑا نمایاں حصّہ ہے۔ اس بنا پر ان صفحات میں آج ہم اس تحریک کا تعارف، اس کے افکار اور ان کی فکری لغزشوں کو پیش کرتے ہیں۔

مُعتزلہ کے نام کے بارے میں ہمیں متعدد اقوال ملتے ہیں۔ احمد امین نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں اس کی مندرجۂ ذیل وجوہ لکھی ہیں:

(۱) اس تحریک کے داعیٔ اوّل واصل بن عطاء کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دن وہ حضرت حسن بصری کے حلقۂ درس میں شریک تھے کہ اُن سے نجات کے مسئلہ پر اختلاف ہو گیا۔ واصل بن عطاء درس سے اٹھ کر الگ ہو گئے۔ اس پر حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ اعتزل عنّا یعنی وہ ہم سے الگ ہو گیا[۱]۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کے محض الگ

---

[۱] احمد امین نے اس پر کئی ایک اعتراضات کیے ہیں:

• واصل یا عمرو بن عبید کا مسجد میں ایک حلقے سے نکل کر دوسرے حلقے میں چلا جانا اتنی اہم بات نہ تھی کہ اس سے ایک فرقہ کی بنیاد پڑ جاتی۔

• پھر رواۃ کا اس معاملے میں بڑا اختلاف ہے بعض اسے واصل کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بعض عمرو بن عبید کی طرف۔ پھر بعض کا خیال یہ ہے کہ حلقۂ درس حضرت حسن بصری کا تھا اور بعض لوگ اُسے قتادہ بن دعامۃ السدوسی کا حلقہ سمجھتے ہیں۔ اس رائے کو زہدی حسن جار اللہ نے بھی اپنی کتاب المعتزلہ ص۲ میں نقل کیا ہے۔ (فجر الاسلام ص ۲۸۸-۲۸۹)

جا بیٹھنے کی وجہ سے ان کا نام معتزلہ نہیں پڑا بلکہ اس کی وجہ وہ نظریاتی اختلاف تھا جو اہلِ سنّت اور واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے عقائد میں پایا جاتا تھا۔ ان دونوں حضرات کا یہ خیال تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مطلقاً مومن ہوتا ہے اور نہ مطلقاً کافر بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک درجے میں ہوتا ہے۔ اسی عقیدہ کو المعتزلہ اپنی مخصوص زبان میں یوں کہا کرتے تھے:

انہ لامومن ولا کافر بل ھو فی منزلۃ بین منزلتی الایمان والکفر

• دوسری رائے یہ ہے کہ معتزلہ کا نام اس وجہ سے معتزلہ پڑ گیا کہ وہ تمام نئے اقوال سے الگ تھلگ رہتے تھے یعنی گناہ کبیرہ کے بارے میں جتنی آراء پہلے سے موجود تھیں وہ ان سب سے الگ رائے رکھتے تھے۔ مرجئہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو مومن سمجھتے تھے اور اس کے مقابلے میں خوارج اسے کافر گردانتے تھے۔ حسن بصری اسے منافق سے تعبیر فرماتے واصل اور اس کے مؤیدین نے ان تمام اقوال کی مخالفت کر کے ایک نئی راہ اختیار کی کہ وہ نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ یہ رائے ایک نئے طرزِ فکر کی ترجمانی کرتی ہے اسی وجہ سے اسے اعتزال سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معتزلہ کے نام کے بارے میں کئی ایک اور بھی اقوال ملتے ہیں لیکن وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اس لیے ہم انہیں نظر انداز کر کے معتزلہ کے عقائد کی طرف لوٹتے ہیں۔ خصوصاً وہ عقائد جو انہوں نے یونانی افکار سے اخذ کیے کیونکہ انہیں افکار کے مطالعہ سے ان کی تجدد پسندی کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے:

معتزلہ بڑے جذبہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو اصحابِ عدل اور اصحابِ توحید کہا کرتے تھے (اہل العدل والتوحید)، امام احمد بن یحییٰ مرتضیٰ نے اپنی کتاب المنیۃ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل میں یہ کہا ہے کہ یہ حضرات اپنے آپ کو العدلیۃ والموحدہ بھی کہا کرتے تھے۔ (سلہ)

باری تعالیٰ واقعی عادل اور واحد ہے۔ اس سے بڑھ کر عدل کرنے والی کوئی دوسری ہستی نہیں اور اس کی ذات میں کوئی دوسرا شریک وسہیم نہیں۔ وہ اپنی ذات میں یکتا ہے، اپنی صفات

میں منفرد ہے، اپنے اختیارات میں لا شریک ہے اور اپنے معاملات میں کسی دوسرے کا عمل دخل گوارا نہیں کرتا۔

المعتزلہ جب باری تعالیٰ کو عادل کہتے تھے تو اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اس ذات بے ہمتا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نیکوں اور پاکبازوں کو اچھے اعمال کی جزا دے اور گنہگاروں کو ان کی بداعمالیوں کی بنا پر جہنم میں جھونک دے۔

اس ایک عقیدے سے متعدد دوسرے عقائد جنم لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے عادل اور یوم جزا کے مالک ہونے کا تصور معتزلہ کے نزدیک اُسی صورت میں اپنے اندر معنویت رکھتا ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ انسان اپنے افعال و اعمال میں خود مختار ہے اور اپنے ارادہ و مرضی کے مطابق وہ جو طرزِ عمل اختیار کرنا چاہے، اختیار کر سکتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے معتزلہ کے خیالات قدریہ سے ملتے جلتے تھے۔ معتزلہ کے نزدیک باری تعالیٰ انسانی افعال و اعمال کا خاموش تماشائی ہے اور اُس کی بلند و برتر ذات انسانوں کے معاملات میں دخیل ہونا پسند نہیں کرتی۔ وہ نہ تو نیکی پر انہیں اُبھارتی اور نہ بُرائی کے ارتکاب سے روکتی ہے[1]۔ انسان اس دنیا میں قوانینِ طبیعی کا پابند ہے اور وہ جس طرح کے اعمال کرے گا اسی کے مطابق اُسے جزا و سزا دی جائے گی جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے سے انسان کا جلنا ناگزیر ہے اسی طرح بُرائی کا عذاب بھی ضروری ہے۔ معتزلہ کا خیال یہ تھا کہ اگر انسانی اعمال میں اللہ کو دخیل مان لیا جائے تو قیامت کے دن انسان کا محاسبہ بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اگر ہر فعل کا محرک باری تعالیٰ ہے اور انسان کی حیثیت محض ایک اداکار کی سی ہے تو پھر وہ نہ تو اپنے کسی اچھے کام کے لیے اجر کا مستحق ہے اور نہ بُرے کام کے لیے سزا کا مستوجب۔ اس کے علاوہ انسان کو قدرت کے ہاتھ میں بالکل ایک کھلونا مان لینے سے اُس کے کسی فعل پر محمود[2] و مذموم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ جب آپ یہ کہتے

---

[1] الفرق بین الفرق از ابو منصور عبد القاہر بن طاہر بن محمد البغدادی۔ مطبعۃ المعارف، مصر ص ۹۴

[2] کتاب المنیہ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل احمد بن یحییٰ المرتضیٰ۔ حیدر آباد۔ ص ۴۵

ہیں کہ انسان کسی زبردست قوت اور کسی صاحب اختیار ہستی کے اشارے پر ایک خاص نوعیت کا طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور رہے تو آپ اُس کے اس طرز عمل کو اچھا یا بُرا کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ انسان کے نیک و بد ہونے کا انحصار اسی بات پر ہے کہ وہ اپنے اعمال میں خود مختار ہو اور اپنے ارادے سے نیکی کا راستہ اختیار کرے اور برائی سے مجتنب رہے۔

معتزلہ اپنے اس استدلال کو مستحکم بنانے کے لیے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر انسان کے سارے اعمال باری تعالیٰ کے ارادہ و منشا کے براہ راست تابع ہیں اور انسان خدا کے ہاتھ میں مجبور محض ہے تو پھر اُسے انبیاء علیہم السلام اور رُسل بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اُس نے کسی شخص کے مومن و مسلم ہونے کا فیصلہ پہلے ہی کر دیا ہے تو انبیاء کی ہدایت یا اُن کی تنبیہ اُس کے حق میں عبث اور بیکار ہے بلکہ ان نفوسِ قدسیہ کی بعثت بالکل بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔[1]

اسی ضمن میں ایک اور چیز معتزلہ کی پریشانی کا باعث تھی۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اگر انسان کے سارے اعمال باری تعالیٰ کے ارادے اور منشا کے براہِ راست رہینِ منت نہیں ہیں تو پھر اُس عادل ذات کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ انسان کو اُس کی بداعمالیوں کی سزا دے اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ معاذاللہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ ارشاد فرمایا ہے[2]: انہ تعالیٰ لا یظلم الناس شیئًا۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بندوں کے انہیں گناہوں کی سزا دیگا جو وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے[3] کرتے ہیں اور جن کے ارتکاب کی ذمہ داری براہ راست ان پر عائد ہوتی ہے۔ شہرستانی نے معتزلہ کے ان عقائد کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

---

[1] المعتزلہ تالیف زہدی حسن جاراللہ۔ القاہرہ ۱۹۴۷ء صـ ۹۶

[2] " " " صـ ۹۷

[3] قدریہ اور معتزلہ کو اگرچہ مسئلہ جبر و قدر کے بارے میں ایک دوسرے کا ہم خیال سمجھا جاتا ہے لیکن اس بارے میں ان کے نظریات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کافی اختلاف ہے۔ قدریہ تو اس بات کے قائل ہیں کہ انسان اپنے اعمال کا نقشہ بھی خود ہی تیار کرتا ہے۔ اور اپنے ارادے

"معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال کا خواہ وہ اچھے ہوں یا برے خود خالق ہے اور اُسے آخرت میں اپنے کیے ہی کی سزا و جزا دی جاتی ہے۔ یہی وہ اساسی تصور ہے جس سے باری تعالیٰ کی طرف کسی شر یا ظلم کو منسوب کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ہم یہ باور کر لیں کہ باری تعالیٰ شر اور ظلم کا خالق ہے تو اُس سے اُس ذات برحق کی تنقیص ہوتی ہے اور اُسے ایسے اعمال کا ذمہ دار ٹھیرنا پڑتا ہے جن کی نسبت اُس کامل و اکمل ذات کی طرف کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں[1]۔"

اسی عقیدہ کی ایک کڑی معتزلہ کے ہاں عقل کا تفوق اور برتری بھی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے کسی چیز کے اچھے اور برے ہونے کی اساس یہ ہے کہ اُسے باری تعالیٰ نے یہی حیثیت دی ہے بعض افعال و اعمال یا بعض اشیاء اُس کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں۔ اس وجہ سے اُس نے انسان کو اُن سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض چیزیں اس کی نظر میں پسندیدہ اور مفید ہیں۔ اس بنا پر باری تعالیٰ نے اُن سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی تلقین فرمائی ہے۔ معتزلہ کے خیال کے مطابق خود باری تعالیٰ نے مختلف افعال و اعمال اور مختلف اشیاء کے درمیان اچھے برے کی جو تمیز کی ہے اس میں بھی اُس نے انسانی عقل کے پیش نظر ہی فیصلہ فرمایا ہے۔ اسی وجہ سے عقل خود علم شریعت کے بغیر حسن و قبح کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ معتزلہ کے خیال کے مطابق ہر چیز کی ایک ذاتی صفت ہوتی ہے جو اُسے حسین و قبیح بنا دیتی ہے مثال کے طور پر سچائی اور صدق میں ایک ذاتی صفت ہے جو اُس کے اندر حسن پیدا کرتی ہے اور جھوٹ اور

سے اس نقشہ کی تکمیل کرتا ہے اور اپنی قدرت و استطاعت کے بل پر اُن اعمال کی تخلیق کرتا ہے جن کی انجام دہی مقصود ہوتی ہے لیکن معتزلہ ان کے مقابلے میں اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں کے اعمال کا نقشہ خود باری تعالیٰ نے ازل سے تیار کر رکھا ہے اور وہ اُن اعمال کو جو اس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں سرانجام دیتا ہے اور یہ اعمال سراپا خیر ہوتے ہیں۔ باقی رہے وہ انسانی اعمال جن میں خیر اور شر دونوں پائے جاتے ہیں، باری تعالیٰ نہ تو اُن کی تخلیق کرتا ہے اور نہ اُن کی تخلیق میں حائل ہوتا ہے بلکہ اس معاملے میں اُس نے انسان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے۔

[1] کتاب الملل و النحل۔ شہرستانی جلد اوّل صفحہ ۳۰

کذب خود اپنی ذات میں قبیح اور مکروہ فعل ہے۔ شریعت نے کسی بات کا حکم دے کر اُسے پسندیدہ نہیں بنایا اور نہ کسی بات سے منع کر کے اُسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے بلکہ شریعت نے کسی کام پر نیک و بد کا حکم صرف اسی بنیاد پر لگایا ہے کہ وہ بات فی ذاتہٖ حسین اور پسندیدہ ہے اور دوسری بات فی نفسہٖ قبیح اور بُری ہے۔ شریعت کا یہ طرزِ فکر بالکل فطری ہے کیونکہ اس کے اوامر و نواہی درحقیقت اس حسن و قبح کے تابع ہیں جو اشیاء اور اعمال میں فی ذاتہٖ موجود ہیں[1]۔

یہ تھا وہ غلط اندازِ فکر جس کے مطابق شریعت کا وزن کم ہوا اور عقل کی فوقیت اور برتری قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔

گذشتہ صفحات میں معتزلہ کے عقائد کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو ان سب میں آپ کو ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب ملے گی۔ یہ نظریات سراسر باطل اور غلط نہیں۔ ان کے کئی ایک اجزا شریعت کے عین مطابق ہیں اور اہلِ سنّت کے مسلّمہ عقائد سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہی بات درست ہے تو پھر صلحاء امت نے معتزلہ کی مخالفت کیوں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معتزلہ کے یہ عقائد جس بنیادی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں، چونکہ وہ غلط ہے اس لیے یہ نظریات بظاہر درست ہونے کے باوجود اپنے اندر بہت سی گمراہیاں رکھتے ہیں۔ باری تعالیٰ بے شک عادل ہے وہ کسی شے پر ظلم نہیں کرتا لیکن معتزلہ جس وجہ سے اُسے عادل کہتے تھے وہ یہ تھی کہ ذاتِ برحق محض علت العلل ہونے کی وجہ سے سوائے ایک لگا بندھا طرزِ عمل اختیار کرنے کے اور کوئی دوسرا طرزِ عمل اختیار ہی نہیں کر سکتی جس طرح فطرت کے قوانین میں کوئی ارادہ اور اختیار نہیں ہوتا اور ان کے نتائج ناگزیر ہوتے ہیں بالکل اسی طرح معتزلہ کے قول کے مطابق باری تعالیٰ ایک لگا بندھا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ اُن کے نزدیک خالقِ کائنات کوئی صاحبِ ارادہ ہستی نہیں بلکہ کائنات کی بنیادی علّت ہے اور وہ میکانکی طور پر اپنا عمل جاری رکھتی جا رہی ہے۔

معتزلہ انسان کو اپنے عمل میں آزاد اور صاحبِ اختیار مانتے تھے۔ یہ بات ایک حد تک درست

---

[1] احمد امین: فجر الاسلام ص ۳۴۹ و ص ۳۵۰

ہے۔ انسان کو ایک محدود پیمانے پر فکر و عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں لیکن معتزلہ جس بنا پر انسان کو با اختیار ہستی تسلیم کرتے تھے اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہ تھی کہ جس طرح علت کا لگا بندھا سلسلہ خاموش تماشائی کی حیثیت سے مختلف اسباب کے نتائج برآمد کرتا رہتا ہے اسی طرح باری تعالیٰ بھی انسان کے افعال و اعمال سے بالکل بے تعلق رہ کر اُن کے اچھے یا بُرے پہلوؤں کا جائزہ لے کر انہیں جزا و سزا دیتا ہے۔ انسانی اعمال کا رُخ موڑنا اس کا کام نہیں۔ معتزلہ نے خدا کا جو تصور پیش کیا اس کے مطابق اس کی حیثیت الجبرا کے ایک فارمولے سے زیادہ نہیں رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ معتزلہ نے شفاعت کا بھی انکار کر دیا[1]۔ کیونکہ اس عقیدے سے بھی باری تعالیٰ کے صاحبِ ارادہ ہستی ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہی حال انسانی عقل کا ہے۔ انسان کو بلاشبہ شعور اور وقوف عطا کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں بار بار اُسے انفس و آفاق پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اسلام نے بعض چیزوں کو حرام اور بعض افعال و اعمال کو جو ناپسندیدہ قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ چیزیں یا وہ اعمال اپنی ذات میں قبیح و مکروہ ہیں۔ شریعت میں عقل کا بھی ایک مقام ہے لیکن یہ سمجھنا کہ شریعت کا سارا نظام عقل کے تابع ہے بالکل صحیح نہیں۔ عقل، ماحول، حالات و واقعات اور تجربات کے بل بوتے پر کام کرتی ہے اس لیے اس کے فیصلوں میں کبھی سو فیصد صحت نہیں پائی جا سکتی اور اس بنا پر اس میں وہ قطعیت حاصل نہیں ہو سکتی جو ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ معتزلہ نے انسانوں سے عقل کی برتری تسلیم کروانے کے لیے صرف اس بنا پر زور دیا کہ اس سے شریعت میں فیصلہ کن حیثیت رسول کو حاصل ہونے کی بجائے عقل کو حاصل ہو اور اس طرح انہیں وہ سارے تصورات و اعمال شریعت سے خارج کرنے میں آسانی ہو جو اُن کے زعم کے مطابق خلافِ عقل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ نے بڑی آزادی کے ساتھ شرعی مسائل میں تغیر و تبدل شروع کیا اور اُن سارے معتقدات کو تسلیم کرنے میں تردد ظاہر کیا جو اُن کی نظر میں عقل کے خلاف تھے۔

---

[1] المعتزلہ تالیف زہدی حسن جار اللہ ص ۵۳

آپ اس طرزِ فکر کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سے شریعت کا پورا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بعض اشیاء کو حلال اور بعض کو حرام اور بعض عقائد و نظریات کو مفید اور بعض کو مضر اور بعض اعمال کو پسندیدہ اور بعض کو ناپسندیدہ ٹھیرایا ہے تو اس نے یہ کام اپنے وسیع علم کے مطابق کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کے فیصلے حکمت پر مبنی ہیں اور عقلِ سلیم اسے سمجھ سکتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کی محدود عقل اُن سارے معتقدات پر پوری طرح حاوی ہوسکے۔ یہی ایمان بالغیب کی بنیاد ہے۔ جب ایک فرد یا گروہ شرعی معاملات میں عقل کو فیصلہ کُن حیثیت دے کر شریعت کو اس کے تابع بناتا ہے تو وہ بالآخر اُن سارے معتقدات کا انکار کرنے پر مجبور ہوگا جو وہ اپنی عقل کے مطابق نہیں پاتا۔ اسی بنا پر معتزلہ نے حوضِ کوثر، پُل صراط، میثاق اور معراج[1] کا انکار کیا اور اُن ساری احادیث کو رد کر دیا جن میں ان کا ثبوت ملتا ہے۔

اسلام میں بیشمار معتقدات ایسے ہیں جنہیں علت و معلول کی کڑیوں میں جوڑا نہیں جا سکتا۔ معتزلہ نے عقل کا سہارا لے کر ان سارے نظریات کے خلاف ایک محاذ قائم کیا۔ اُن کے ہاں علت و معلول کا سلسلہ کتنا اٹل اور ناگزیر تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ دعا کی افادیت کے بھی قائل نہ تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ تقدیرِ الٰہی کو بدلا نہیں جا سکتا اس لیے دعا سے کوئی خاص مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر دعا میں جو مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ باری تعالیٰ کے نقشہ کے مطابق ہے تو وہ دعا نتیجہ خیز ہو سکتی ہے اور اگر وہ اس نقشہ کے خلاف ہے تو پھر وہ بالکل بے اثر ہے۔

معتزلہ کے یہ سارے افکار و نظریات چونکہ اُن کے تصورِ باری تعالیٰ سے ماخوذ ہیں اس لیے آخر میں ہم اسی پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ معتزلہ کے نظریات کو سمجھنے کے لیے اُن کی بنیادی لغزش کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ یہ حضرات، جیسا کہ میں آغاز میں عرض کر چکا ہوں، یونانی افکار سے مرعوب تھے اور ارسطو کے نزدیک خدا کی حیثیت ریاضی کے ایک کلیہ کی سی تھی جس کے مطابق ہر سبب لازمی طور پر ایک نتیجہ برآمد کرتا ہے۔ علت و معلول کا بے جان اور

---

[1] معتزلہ حضور سرورِ کائنات کے بیت المقدس تک جانے کے قائل تھے۔

ارادہ و اختیار سے یکسر عاری نظام اس پوری کائنات کو میکانکی انداز پر چلا رہا ہے۔

معتزلہ بڑے طمطراق کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کیا کرتے کہ وہ توحید خالص کے قائل ہیں اور باری تعالیٰ کو ہر قسم کے شرک سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کے قول کے مطابق باری تعالیٰ یکتا ہے اور قدیم ہے اور اس معاملے میں کوئی دوسری صفت یا چیز اس کی شریک و سہیم نہیں۔ چنانچہ جو لوگ باری تعالیٰ کی صفات کو بھی اُس کی ذات کی طرح قدیم مانتے ہیں وہ درحقیقت توحید خالص کے منکر ہیں۔ اسی بنا پر معتزلہ نے اس کا انکار کیا کہ خدا کے لیے علم، قدرت، حیات، سمع، بصر وغیرہ قسم کی ازلی صفات بھی ہیں جو اس کی ذات سے الگ ہیں بلکہ خدا بایں معنی قادر، حی، سمیع اور بصیر ہے کہ وہ فی ذاتہٖ ایسا ہے۔ اس کی کوئی صفت بھی اس کی ذات پر زائد یا الگ نہیں۔ صفاتِ قدیمہ کو تسلیم کرنا گویا خدا کے تعدّد کو ماننا ہے۔ حالانکہ خدا واحد ہے، اس کا کسی جہت اور کسی اعتبار سے بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ اور یقیناً اس کی ذات میں کوئی کثرت نہیں[1]۔ معتزلہ نے تجرید و تنزیہ کے جوش میں بڑھ کر یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے نفس و جود تک کا انتساب غلط ہے۔ اور باری تعالیٰ کے حق میں موجود و لاموجود کا استعمال صحیح نہیں۔

جس شخص نے بھی الہامی مذاہب کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ان مذاہب میں سے کسی ایک نے بھی باری تعالیٰ کو محض محرکِ اوّل کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اسلام جس خدا کے تصوّر کو پیش کرتا ہے وہ تجریدی نہیں بلکہ ذات ستودہ صفات ہے جس میں زندگی کی حرارت ہے، جو کائنات کے ساتھ گہری محبت رکھتا ہے، جو صاحبِ ارادہ ہے، جو علیم و بصیر ہے اور کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے نہ صرف اُسے اچھی طرح دیکھتا اور جانتا ہے بلکہ اُس کی براہِ راست نگرانی کر رہا ہے۔ انسان جب تک ایسی حیّ و قیوم ہستی پر ایمان نہیں لاتا اُس وقت تک اُسے وہ ذہنی سکون اور قلبی اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا جو مذہب انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔ ریاضی کے لگے بندھے فارمولوں اور علّت و معلول کی بے جان کڑیوں یا مجرّد تصوّر سے تو اخلاق و روحانیت کے تقاضے

---

[1] فجر الاسلام احمد امین ص ۳۴۹

پورے نہیں ہوتے۔

معتزلہ نے اس سلسلے میں بنیادی غلطی یہ کی کہ انہوں نے اُس نقطۂ نگاہ کو یکسر نظر انداز کیا جس کے مطابق ایک صحیح العقیدہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی طرف علم و حکمت یا قدرت وغیرہ صفات کو منسوب کرتا ہے۔ ایک مسلمان صفاتِ الٰہی کے ساتھ بلا کیف کی قید بڑھانا ضروری سمجھتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا علم، اس کی حکمت اور اُس کی قدرت ایسی نہیں کہ اُسے موجودات کی کسی بھی نوعیت پر قیاس کیا جا سکے۔ انسان جب کسی صفت کا اندازہ کرتا ہے تو اس کا ذہن لازمی طور پر اس چیز کی طرف جائیگا جو اس صفت سے متصف ہے۔ یہ امر ناگزیر ہے۔ لہٰذا صفات کی نفی محض اس بنا پر صحیح نہیں کہ اس سے تجسیم کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

جب باری تعالیٰ کی ذات ازلی اور ابدی ہے تو لامحالہ اُس کی صفات بھی ازلی و ابدی ہونگی وہ ذاتِ برحق اپنی جملہ صفات کے ساتھ قدیم ہے۔ ذات و صفات کی اس تفریق کا سرچشمہ یونانی فلسفہ ہے جس نے ہیولے و صورت کو الگ الگ ٹھہرایا ہے خارج میں جتنی اشیاء بھی پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب صفات سے متصف ہوتی ہیں بلکہ ان صفات کی وجہ ہی سے ان کی صحیح پہچان کی جاتی ہے اور اسی سے ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال میں کسی شے کو اُس کی صفات سے الگ کر کے تصور کرنا بالکل ناممکن ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات اور اُس کی صفات دونوں لازم ملزوم ہیں ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ امام احمد بن حنبل نے کتنا صحیح کہا ہے کہ خدا کی صفات بیان کرتے ہوئے ہم یہ نہیں کہتے کہ اللہ اور اس کا علم، اللہ اور اس کی قدرت اور اللہ اور اس کا نور بلکہ یہ کہتے ہیں:

اللہ بعلمہ وقدرتہ ونورہ	اللہ اپنے علم، اپنی قدرت اور نور کے ساتھ ایک
اللہ واحد۔ بل ننطق بما یبین ان	ہی معبود ہے۔ ہم ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں
صفاتہ داخلۃ فی مسمیٰ اسمہ	جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کی صفات، اس کے

نام، اور مسمیٰ میں داخل ہیں۔ ان سے الگ کوئی چیز نہیں۔

(باقی)

تفہیم القرآن

جلد چہارم

سورۂ لقمان ــــــــــ سورۂ الاحقاف

الحمد للہ جلد چہارم طبع ہو چکی ہے ۔ اور فرمائشوں کی تعمیل بالترتیب شروع ہے ۔ آج ہی تجدید فرمائش کے ہمراہ دس روپے پیشگی ارسال فرما دیں ۔ بقیہ کا وی ۔ پی بھیجدیا جائے گا ۔ یہ جلد عمدہ کاغذ پر آفسٹ میں طبع ہوئی ہے ۔

ہدیہ ۔/۲۶ خرچہ ڈاک ۱/۷۵ کل ۲۷/۷۵ روپے ہے

تفہیم القرآن

جلد اول ختم ہے ۔ یہ بھی آفسٹ پر نظر ثانی شدہ نیا ایڈیشن زیر طبع ہے ۔

جلد دوم ۔ ہدیہ ۲۴/۵۰ اور

ہدیہ ۲۷/۵۰ موجود ہیں ۔

فرمائش بھیجنے کا پتہ

شیخ محمد قمر الدین، پروپرائٹر مکتبۂ تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور

مسلمان حکومتوں کے اتحاد کی تحریک

ابوالاعلیٰ مودودی

[یہ ایک تقریر ہے جو ۱۵ اکتوبر ۶۶ء کو بی این آر آڈیٹوریم میں موتمر عالم اسلامی کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں کی گئی تھی۔]

الحمد للہ العلی العظیم، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

جناب صدر اور معزز حاضرین، موجودہ صدی کے ابتدائی دور میں دنیا پر جو اجتماعی فلسفہ چھایا ہوا تھا، وہ نیشنلزم کا فلسفہ تھا۔ لوگوں کے ذہن میں انسان کی قومی و اجتماعی زندگی کا کوئی تصور اس کے سوا نہ آتا تھا کہ ہر قوم نہ صرف یہ کہ آزاد و خود مختار ہو بلکہ اس کا ایک ایک فرد اپنی قومیت کا پرستار بھی ہو، دوسری قوموں کو اپنی قوم کے مقابلے میں پست تر رکھنے کی کوشش کرے؛ اور اپنی قوم کو تمام قوموں پر بالاتر اور غالب کرنے کے لیے جان لڑا دے۔ لوگ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اجتماعی زندگی کی اگر کوئی معراج ہے تو وہ قومی ریاست (NATION STATE) ہے جس کو خدا کا مقام قوموں نے دے دیا تھا۔

اس تصور کا نقصان عظیم سب سے پہلے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ساری دنیا نے دیکھا۔ اپنی اپنی قومیتوں کے پرستار جب اس جذبے کے ساتھ اٹھے کہ اپنی قوم کو دنیا پر غالب کرنا ہی انسان کی زندگی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اور جب انہوں نے اپنی قومی ریاست کو اپنا معبود اور اپنا الٰہ بنا کر یہ سمجھ لیا کہ اس معبود کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینا ہی انسانیت کی معراج ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی جنگ میں مختلف قومیں ایک دوسرے کے لیے درندوں سے بدتر ہو گئیں۔ آبادیوں کی

آبادیوں کو تباہ کر ڈالا گیا۔ ملک کے ملک غارت کر دیئے گئے۔ اخلاق اور تہذیب اور آدمیت کی ساری اقدار پامال کر کے رکھ دی گئیں۔

اپنے اس فلسفے کا یہ ثمرہ جب دنیا نے دیکھ لیا تو پہلی مرتبہ یہ تخیل جنگِ عظیم اوّل کے بعد اُبھرنا شروع ہؤا کہ قوموں کے درمیان اتحاد کی کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے جس میں ہر قوم اپنی قومی حاکمیت سے کچھ نہ کچھ دست بردار ہو اور مختلف قومیں مل کر ایک مرکزی اقتدار وجود میں لائیں جو قوموں کو تصادم سے بچاتے اور ان کے درمیان مصالحت و موافقت کی صورتیں نکالے۔ اس غرض کے لیے ایک لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) قائم کی گئی۔ لیکن جس روز وہ وجود میں آئی اُسی روز یہ معلوم ہو گیا کہ "بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند"۔ اسی روز سے اس نے ملکوں کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے اور مختلف قوموں کو بڑی بڑی سلطنتوں کے انتداب (MANDATE) میں دینے کا ایک نرالا طریقہ ایجاد کر لیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اب کمزور قوموں پر حملے کر کے ملک فتح نہ کیے جائیں گے بلکہ لیگ آف نیشنز اُن کو تحفے کے طور پر بڑی قوموں کے حوالے کیا کرے گی۔ اسی زمانے میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا تصور پیدا ہؤا اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لا لا کر اس سرزمین میں بسایا جانے لگا جو خالی پڑی ہوئی نہ تھی بلکہ صدہا برس سے اہلِ عرب اس میں آباد چلے آرہے تھے۔

یہ گویا سامان تھا قوموں کے باہمی تصادم کو روکنے کا اور ان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ انسان نے پہلی جنگِ عظیم کے تلخ تجربے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، بلکہ اس تجربے کو اور اس تجربے کے متعلق جو باتیں دنیا کے اہلِ فکر کر رہے تھے، ان کو محض دھوکے اور فریب دینے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا۔ بظاہر نام یہ لیا گیا کہ ہم قوموں کے درمیان موافقت پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن دراصل وہی نیشنلزم اپنے پورے زور شور کے ساتھ قوموں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ اور اسی پر قوموں اور ملکوں کی پالیسیاں مبنی رہیں۔

امن و صلح اور بین الاقوامی انصاف کے سارے دعووں کے باوجود اکیس سال تک کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے پڑتے رہے، دنیا کے ہر گوشے میں فساد کے بیج بوتے جاتے رہے، اور

اسلحہ فراہم کرنے کا سلسلہ اتنے بڑے پیمانے پر جاری رہا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ آخرکار دوسری جنگِ عظیم ہوئی جو پہلی جنگِ عظیم سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس میں کروڑوں انسان تباہ کر دیئے گئے۔ ملک کے ملک غارت کر دیئے گئے۔ پوری پوری قوموں کو ان کے وطن سے اکھاڑ کر دوسرے علاقوں میں دھکیل دیا گیا۔ پورے پورے ملکوں کی آبادیاں اسیرانِ جنگ میں تبدیل ہو گئیں اور انسان نے انسان پر وہ ظلم ڈھائے جنہوں نے وحشی درندوں کو شرما دیا۔

اس دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کو پھر یہ خوشخبری سنائی گئی کہ اب قوم پرستی کی ماری ہوئی انسانیت کو بین الاقوامی انصاف سے بہرہ ور کیا جائے گا، چنانچہ اس غرض کے لیے "اقوامِ متحدہ" کو جنم دیا گیا، انسانی حقوق کا منشور بنانے کی باتیں کی گئیں، اور ایک سیکیورٹی کونسل بنائی گئی تاکہ وہ دنیا میں امن قائم کرے۔ لیکن آپ سبھی کو معلوم ہے کہ وہ سیکیورٹی کونسل کیسا امن قائم کر رہی ہے۔ پچھلے ہی سال ہمیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ کشمیر کے متعلق اس کی قراردادیں ۱۸ سال سے دنیا کا منہ چڑا رہی ہیں۔ فلسطین سے دس لاکھ آدمی اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور ان کی جگہ زمین کے ہر کونے سے لائے ہوئے یہودیوں کا قومی وطن بنایا گیا ہے۔ قبرص میں ترک اقلیت کو اس کی آنکھوں کے سامنے فنا کر دینے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ رہوڈیشیا، انگولا، جنوبی افریقہ، ویت نام اور دوسرے بہت سے مقامات پر کھلا ظلم اور بے انصافیاں جاری ہیں اور "اقوامِ متحدہ" ان کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ رہا انسانی حقوق کا منشور، تو آج تک قوموں نے اس کی پابندی کا اقرار نہیں کیا، کسی ملک نے اس کو اپنے قوانین میں جگہ نہیں دی، کوئی ادارہ ایسا وجود میں نہیں آیا جس سے وہ اشخاص، گروہ یا قومیں رجوع کر سکیں جن کے انسانی حقوق پر دست درازی کی گئی ہو۔

یہ حالات ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر امن اور سلامتی اور انصاف کی ان بین الاقوامی ایجنسیوں سے دنیا مایوس ہوتی جا رہی ہے اور اب موجودہ زمانے کے مفکرین بڑے زور شور سے اس خیال کو پیش کرنے لگے ہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ کم از کم ذہن و فکر کی دنیا میں یہ بات اب مسلّم ہو چکی ہے کہ قوم پرستی اور قومی ریاستوں کی معبودیت دنیا کے مصائب کی جڑ ہے اور انسانیت کو اس وقت تک امن نصیب نہیں

ہو سکتا جب تک کہ مطلق العنان قومی ریاستوں کی جگہ ایک عالمی ریاست (WORLD STATE) وجود میں نہ آجائے۔ تمام دنیا کی ایک حکومت ہو۔ مختلف قوموں کو اس میں داخلی خود مختاری حاصل رہے۔ ان کے مذہب، ان کی تہذیب، ان کے تمدن، ان کی زبان کے لیے اس میں پورا تحفظ موجود ہو۔ مگر یہ قومیں ان بلند ڈھوں کی طرح نہ رہیں جو ہر وقت ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ بلکہ کوئی ایک طاقت ایسی ہو جو دنیا کے معاملات کو درست رکھے اور قوموں کے درمیان صحیح طور پر ان کے حقوق تقسیم کرے۔

لیکن یہ محض ایک تخیل ہی تخیل ہے۔ ایک خوشنما اور پاکیزہ خواہش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا کوئی نظریہ دنیا کے پاس ایسا ہے جو واقعی ایک عالمی ریاست (ورلڈ اسٹیٹ) کو وجود میں لا سکتا ہو۔ کیا عیسائیت اس کی بنیاد بن سکتی ہے؟ کوئی عیسائی صاحب اگر یہاں موجود ہوں تو میں ان سے معذرت چاہتا ہوں، لیکن حقیقت تو حقیقت ہی ہے۔ عیسائیت نے سرے سے اسٹیٹ ہی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی ہے، ورلڈ اسٹیٹ کا کیا سوال۔ وہ تو پہلے ہی قیصر کے حق میں جہانبانی سے دست بردار ہو چکی ہے۔ اور جہاں تک نوع انسانی کو متحد کرنے کا تعلق ہے عیسائیت نے اس مسئلے سے دلچسپی ضرور لی ہے مگر وہ اس معاملے میں کبھی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس وقت بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے نیگرو باشندوں کی عظیم اکثریت اگرچہ عیسائی ہے اور اس کا وہی دین ہے جو امریکہ کی سفید فام نسل کا ہے لیکن باوجود اس کے کہ دونوں میں عیسائیت مشترک ہے دونوں کے نام ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، دونوں کی تہذیب ایک ہے پھر بھی وہ ایک چرچ میں جمع نہیں ہو سکتے، ایک بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھ نہیں سکتے، ایک میز پر ایک ریستوران تک میں کھانا نہیں کھا سکتے، ایک بس میں سوار نہیں ہو سکتے، ایک محلے میں رہ نہیں سکتے۔ کہیں گوروں کے علاقے میں کوئی کالا خاندان آبسے تو اس کے گھر پر گولیاں برسائی جاتی ہیں اور کالوں کے بچے گورے بچوں کے ساتھ ایک مدرسے میں پڑھنے چلے جائیں تو بچوں کی ٹانگیں توڑ دی جاتی ہیں۔ یہی صورتِ حال افریقہ میں ہے۔ جنوبی افریقہ میں گورے عیسائیوں کی اقلیت کالی اکثریت کے ساتھ خود اس کے اپنے وطن میں جو کچھ کر رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ براعظم افریقہ میں تو عیسائیت کا عجیب کرشمہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کلیسا اگر کالوں کا ہے تو اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی کالی ہے اور گوروں کا ہے

تو اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی گوری ہے۔ گویا دو عیسیٰ وجود میں لے آئے گئے ہیں کالوں کا عیسیٰ کالا اور گوروں کا عیسیٰ گورا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ دین کسی عالمی برادری اور کسی عالمی ریاست کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

پھر کیا بدھ ازم اس کی بنیاد بن سکتا ہے؟ اس کا حال تو یہ ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات اور اس کی ریاست کے مسائل سے عیسائیت کی بہ نسبت بھی اس نے زیادہ بے تعلقی برتی ہے۔ اس کا پورا لٹریچر اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں انسانی معاملات کو چلانے کے لیے کوئی ہدایت موجود نہیں ہے وہ جو کچھ بھی ہدایت انسان کو دیتا ہے اس غرض کے لیے دیتا ہے کہ دنیا کے اس عذاب خانے سے جس میں کسی نہ کسی طرح وہ آکر پھنس گیا ہے، اور جسم کے اندر انسانی روح کی گرفتاری سے جس میں وہ مبتلا ہو گئی ہے، اس کو رہائی دلوائی جائے۔ گویا دنیا چلانے اور اس کے معاملات کا انتظام کرنے کے لیے وہ کوئی ہدایت نہیں دیتا، بلکہ دنیا سے فرار کرنے کے لیے اور جسم انسانی کی قید سے نکلنے کے لیے وہ راستے بتاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ دین بھی کسی عالمی معاشرے اور ریاست کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

اب کیا ہندو ازم وحدت انسانی کے لیے کوئی بنیاد فراہم کرتا ہے؟ اس نے تو انسانیت کو جمع کرنے کا نہیں بلکہ اسے پھاڑنے اور تقسیم کرنے کا پروگرام دیا ہے، اور اس کے اس پروگرام نے انسانیت کو ایسی بے دردی کے ساتھ پھاڑا ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں ملتی تاریخ میں آپ کو مفتوحین کے ساتھ فاتحوں کے ظلم و ستم کی بد سے بدتر مثالیں ملیں گی، مگر اس ظلم کی کوئی مثال نہ ملے گی کہ ایک قوم باہر سے آکر ملک کو فتح کرنے کے بعد اس کے قدیم باشندوں کو چوہڑے اور چنڈال بنا کر رکھ دے، بیت الخلا صاف کرنے کی خدمت اس کے لیے مخصوص کرے، اسے پیدائشی طور پر ناپاک اور اچھوت قرار دے دے، اور بچے بچے کے دل و دماغ میں یہ فلسفہ گہرا اتار دے کہ اپنے پچھلے جنم کے اعمال کی پاداش میں یہ پیدا ہی ذلیل و خوار ہوئے ہیں اور اس پیدائشی ذلت سے کوئی ان کو نہیں نکال سکتا۔ دنیا میں صرف آریہ ہی وہ نسل ہے جس نے ہندوستان میں اپنے مفتوحوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ انہوں نے انسان اور انسان کے درمیان تفریق اور نسل پر نسل کی برتری کے تخیل کو محض کاغذی فلسفے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ معاشرے کی عملی زندگی میں اسے آخری

حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔ اس تفریق و امتیاز کے لیے آپ کو منو کی دھرم شاستر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اسے آپ ہندو سوسائٹی میں ہر وقت، ہر جگہ پوری شدت کے ساتھ کارفرما دیکھ سکتے ہیں۔ جنوبی ہند میں تو یہ تفریق اس حد کو پہنچی ہے کہ اگر کوئی شودر بیمار ہو اور کسی برہمن ڈاکٹر کو اس کے علاج کے لیے جانا پڑے تو ڈاکٹر چالیس قدم کے فاصلے پر آکر رک جائے گا، بیچ میں ایک اینٹ ڈال دیگا۔ بیمار اینٹ کو مخاطب کر کے کہے گا کہ مجھے یہ تکلیف ہے اور ڈاکٹر اینٹ کو مخاطب کر کے بتائے گا کہ تیرا یہ علاج ہے۔ شودروں کی مختلف اقسام کے لیے مختلف فاصلے ہیں جن سے کم فاصلے پر کوئی شودر برہمن کے قریب چلا جائے تو برہمن ناپاک ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سوسائٹی اور یہ تمدنی و معاشرتی نظام اور یہ فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات کبھی انسانوں کو جمع نہیں کر سکتا۔ یہ تو انسانوں کو پھاڑنے والا ہے نہ کہ جمع کرنے والا۔ حد یہ ہے کہ ہندو ازم میں اگر کوئی آدمی بحری سفر کرے تو اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ جیسا پڑھا لکھا آدمی جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں گیا تو واپس آکر اس کو بڑے بڑے کفارے ادا کرنے پڑے کیونکہ بحری سفر سے اس کا دھرم برہمنوں کے نزدیک بھرشٹ ہو چکا تھا۔ اس نظریے کی بنیاد پر کون سوچ سکتا ہے کہ وحدتِ انسانی کے قیام کا بھی کوئی امکان ہے؟

اسی طرح سے مغربی تہذیب بھی انسانوں کو جمع نہیں کر سکتی۔ وہی تو قوم پرستی کا فتنہ دنیا میں اٹھانے والی ہے۔ اسی نے تو انسانوں کو نیشنلزم کی بیماری میں مبتلا کیا۔ اسی نے تو نیشن اسٹیٹ کو خدا کا مقام دیا۔ وہی تو حیاتِ دنیا کی زینت اور معیارِ زندگی کی بلندی اور مادی خوشحالی کو انسان کا آخری مقصود اور اس کی کوششوں کی غایت الغایات بناتی ہے۔ اس مقصدِ حیات کو اختیار کر لینے کے بعد یہ فطری امر ہے کہ افراد افراد کے مقابلے میں، طبقات طبقات کے مقابلے میں اور قومیں قوموں کے مقابلے میں اس کی خاطر کشمکش کریں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مادی زندگی کے منافع سمیٹنے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں۔ یہ تہذیب کبھی کوئی ایسا نظریہ لا کر آپ کو نہیں دے سکتی جو انسانوں کو جمع کر سکے، ان کے درمیان صلح اور صفائی پیدا کر سکے اور قوموں کو تصادم کے بجائے تعاون کی راہ پر لگا سکے۔ یہ

پھاڑنے والی تہذیب ہے جمع کرنے والی تہذیب نہیں ہے۔ اس تہذیب کے زیر اثر پہلے تو محض حیوانی جبلت کے تحت انسان انسان کا شکار کرتا رہا۔ اہلِ مغرب اسی مقصد کو لے کر امریکہ میں گھسے اور ریڈانڈینس کی پوری نسل کا قلع قمع کر کے ان کے ملک پر قبضہ کیا۔ افریقہ میں گھسے اور وہاں سے دس بارہ کروڑ غلام لے جا کر انہوں نے اپنے مقبوضات کی آباد کاری کے لیے مویشیوں کی طرح ان سے کام لیا۔ مگر بعد میں انہوں نے ایک مستقل فلسفہ اس کے لیے بنا لیا جس کی بنا پر وہ اپنے اس طرز عمل کو سراسر حق بجانب اور عین تقاضائے فطرت سمجھنے لگے۔ اس فلسفے کی رو سے یہ دنیا بس ہی ایک رزم گاہ جس میں تنازع للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTENCE) کا عمل جاری ہے۔ یعنی اس کائنات میں زندگی کی بنیاد نزاع پر قائم ہے نہ کہ موافقت پر۔ اس نزاع میں فطرت اُس کو باقی رکھتی ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زندہ رہنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا فطری ضابطہ ہے اور اسی ضابطہ کے مطابق دنیا میں زندگی کے لائق انواع کا انتخاب ہو رہا ہے، یعنی کمزور کا مٹ جانا اور طاقت ور کا باقی رہنا ہی فطری انتخاب (NATURAL SELECTION) ہے۔ اس نئے فلسفے نے مغربی تہذیب کے پیروؤں کو مطمئن کر دیا کہ اگر وہ کمزور قوموں کو مٹا کر یا دبا کر زمین سے بے دخل کر دیں اور ان کی جگہ خود زمین پر قبضہ کر کے مادی ترقی کے شاندار کرشمے دکھائیں تو یہ کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ نظامِ فطرت یہی کچھ چاہتا ہے اور زمین و آسمان اسی "عدل" پر قائم ہیں۔ یہی فلسفہ اور یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر آج کسی گورے کے ضمیر میں اس بات پر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی کہ امریکہ میں گوری نسل نے ریڈانڈین نسل کو فنا کر کے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اسی فلسفے کی بنیاد پر آج دنیا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ فلسطین میں عرب کوئی ترقی نہیں کر رہے تھے اور یہودیوں نے وہاں جا کر مادی ترقی کے یہ کچھ کمالات دکھائے، لہٰذا اگر عربوں کو مار مار کر اس ملک سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ دنیا بھر سے لا لا کر یہودیوں کو بسا دیا گیا تو یہ قطعاً کوئی ظلم نہ تھا بلکہ یہ تو عین تقاضائے فطرت تھا۔ یورپ اور امریکہ میں آج اسی استدلال سے اسرائیل کے قیام کو حق بجانب ثابت کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فلسفہ جس تہذیب

کا ہو، کیا وہ بھی کبھی وحدتِ انسانی کی بنیاد بن سکتی ہے؟

اب ذرا مارکسزم کو دیکھیے کیا وہ انسانیت کو جمع کر سکتا ہے، شاید وہ اسے اسی وقت جمع کر سکے جب اس کے تصور کے مطابق پوری نوع انسانی میں بس ایک ہی طبقہ باقی رہ جائے گا لیکن جب تک وہ پہلے طبقاتی نزاع برپا کر کے پوری دنیا کو خاک و خون میں نہ ملا نہیں لے گا اس وقت تک وہ اپنے اس نصب العین تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کبھی اس تک پہنچے گا بھی یا نہیں مگر اس کو پہنچنے کے لیے جس راستے سے وہ گزر رہا ہے اور آگے گزرنا چاہتا ہے وہ عالمگیر جنگِ طبقات ہے جس کے ذریعہ سے مار دھاڑ، توڑ پھوڑ، اور خونی انقلابات برپا کر کے پہلے تو وہ مزدور طبقے کی ڈکٹیٹرشپ قائم کریگا پھر صاحبِ ملکیت طبقات کو فنا کریگا، ان کی املاک چھینے گا، ان کو قتل کر کے یا جلاوطن کر کے یا دوسرے کسی طریقے سے ان کا استیصال کریگا تب کہیں انسان کو وہ جنت نصیب ہوگی جس میں روئے زمین پر نوع انسانی کا بس ایک ہی طبقہ موجود ہوگا۔ یہ عمل ابھی روس اور چین میں بھی مکمل نہیں ہوا ہے اس کے بعد نہ معلوم ساری دنیا میں کتنا کچھ توڑ کر اور پھر بنا کر کتنی مدت میں یہ تکمیل کو پہنچے گا۔ کم از کم آئندہ دس بیس نسلوں کو تو اس سے جمع کی نہیں بلکہ ضرب و تفریق ہی کی امید رکھنی چاہیے۔ آج کی دنیا جو امن چاہتی ہے بہر حال مارکسی نظریہ و فلسفہ وہ اس کو نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد اگر میں یہ کہوں تو ہرگز غلط نہ کہوں گا کہ اسلام کے سوا ایسا کوئی نظریہ نہ اِس سے پہلے تھا نہ اب ہے جو انسانیت کو جمع کر سکے اور ایک عالمی ریاست کی بنیاد بن سکے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جو پوری نوع انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور تمام انسانوں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم سب اصل میں ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى "لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے"۔ پھر وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہارے خالق کی بنائی ہوئی فطرت نے تم کو قوموں اور قبیلوں کی شکل میں اس لیے تقسیم نہیں کیا کہ تم آپس میں لڑو بلکہ اس لیے کیا ہے کہ تم آپس کی جان پہچان سے ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ آسانی سے ساتھ تعاون کر سکو۔ یہ تقسیم تعارف کے لیے ہے، تصادم کے لیے نہیں ہے۔ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا "ہم نے تم کو اقوام اور قبائل اس لیے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو"۔ جہاں تک انسانوں کے قوموں

اور قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم ہونے کا تعلق ہے یہ ایک امر فطری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی خاندان میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے قریب ترین لوگ اس کے خاندان ہی کے لوگ ہوتے ہیں جن سے وہ سب سے پہلے متعارف ہوتا ہے۔ پھر ایک شہر یا ایک بستی میں جو خاندان آباد ہوں وہ آپس میں دوسری بستیوں کی بہ نسبت زیادہ تعارف اور میل جول کے مواقع رکھتے ہیں۔ اور ایسا ہی معاملہ خاندانوں کے اُس مجموعے کا بھی ہے جن سے مل کر ایک قوم بنتی ہے۔ انسانوں کے درمیان ربط اور تعامل کی یہی ایک فطری صورت ہے اس لیے انسانوں کے خالق نے اُن کو اقوام اور قبائل کی شکل میں جمع کیا ہے۔ اس کا مقصد باہمی تعارف اور تعاون کے لیے ایک بنیاد فراہم کرنا ہے نہ یہ کہ ایک خاندان، یا نسل یا قوم کے لوگ دوسرے لوگوں کو ذلیل و خوار سمجھیں، ان پر اپنا فخر جتائیں، ان کو دبا کر خود اُن کے سر پر سوار ہو جائیں اور آخر کار اسی کے نتیجے میں قوموں کی وہ آویزش رونما ہو جو خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیتی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فضیلت کی حقیقی بنیاد کسی خاندان، نسل یا قوم میں پیدا ہونا نہیں ہے بلکہ اخلاق کے اعتبار سے بلند اور پاکیزہ تر ہونا ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ "تم میں سب سے زیادہ ذی عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے"۔

یہ ہے انسانیت کا وہ تصور جو دنیا کے تمام انسانوں کو جمع کر سکتا ہے اور ان کو ایک برادری بنا کر ایک عالمی معاشرہ اور ریاست قائم کر سکتا ہے۔ آدمی آدمی کے ساتھ ایک سطح پر مل کر اسی وقت برادرانہ تعلق پیدا کر سکتا ہے جب ہر شخص یہ سمجھے کہ میں ایک خدا کا پیدا کیا ہوا ہوں، ایک ہی خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔ ایک ہی خدا میرا اور تمام انسانوں کا خالق اور رب ہے، ایک ہی مادے سے میری اور دوسرے سب انسانوں کی ہڈی بوٹی بنی ہے۔ اور ہم میں سے کوئی بھی اس وجہ سے اچھا یا بُرا نہیں ہے کہ وہ اتفاقاً کسی باپ کے نطفے اور کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ اچھائی اور بُرائی جو کچھ بھی ہے اخلاق اور اعمال کی ہے۔ اچھے اخلاق اور اچھے عمل جس کے بھی ہوں وہ قابلِ قدر ہے خواہ وہ مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔ اور بُرے اخلاق و اعمال جس کے بھی ہوں وہ کم تر درجے کا انسان ہے خواہ وہ کالا ہو یا گورا۔ یہی حقیقت ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تاریخی خطبۂ حجۃ الوداع میں بیان فرمایا تھا کہ "نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ نہ کسی گورے کو کالے

پر یا کالے کو گورے پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تمہارے درمیان اگر کوئی شخص عزت والا ہے تو بس وہ جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔"

اسلام اس بات کو محض ایک نظریے اور فلسفے کے طور پر پیش کر کے نہیں رہ گیا ہے بلکہ عملاً اس نے ایک معاشرہ انہی بنیادوں پر وجود میں لا کر دکھا دیا ہے۔ اس معاشرے میں اس نے مختلف ملکوں، نسلوں اور قوموں کو بالکل مساوی حیثیت سے جمع کر دیا۔ نسل، رنگ، زبان اور قومیت کے سارے امتیازات مٹا دیئے۔ ان کے درمیان اونچ نیچ اور چھوت چھات کی کوئی تفریق باقی نہیں رہنے دی۔ ایک ہی مسجد میں وہ ایک ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ ایک دستر خوان پر کھانے لگے۔ آپس میں شادی بیاہ کرنے لگے۔ اور جملہ حقوق و فرائض میں ان کے درمیان پوری یکسانی پیدا ہو گئی۔ آج جو لوگ اسلام کے بدترین مخالف ہیں ان کو بھی یہ ماننا پڑا ہے کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی دین، کوئی مذہب، کوئی نظامِ تمدن و معاشرت ایسا نہیں ہے جو نسل و رنگ اور زبان و وطن اور قومیت کی تفریقوں کو مٹا کر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری بنانے میں کامیاب ہوا ہو۔ یہ صرف اسلام ہی کی برکت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کا کمال ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کی حیرت انگیز معجزانہ تاثیر ہے کہ اس نے عملاً نوعِ انسانی کو اس طرح ایک امت بنا دیا۔

پھر اسی نظریے کی بنیاد پر اسلام نے عملاً ایک عالمی ریاست بھی قائم کر کے دکھا دی۔ خلافت راشدہ کے دور میں جب اسلام عرب سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلا تو دنیا کے تمام مسلمانوں کا ایک ہی امیر اور ایک ہی امام تھا۔ تمام بلادِ اسلام میں ایک ہی قانون رائج تھا۔ تمام مسلمان بالکل ایک برادری تھے۔ مشرق سے مغرب تک دنیا کے کسی ملک میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا وہ ٹھیک انہی حقوق کے ساتھ اسلامی معاشرے میں شامل ہو جاتا تھا جو عربوں کے حقوق تھے۔ بلکہ حقوق میں اس کے اور ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کے درمیان بھی کوئی فرق و امتیاز نہ تھا۔ ایک حبشی، ایک رومی، ایک ایرانی، ایک قبطی، ایک بربری کلمۂ اسلام کا قائل ہونے کے بعد ٹھیک اسی صف میں آ کھڑا ہوتا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خاندان اور آپ کی اپنی

قوم کے لوگ کھڑے تھے۔ اس کے واجبات وہی تھے جو ان کے تھے، اس کے حقوق وہی تھے جو ان کے تھے، اس کی حیثیت اور اس کا مرتبہ وہی تھا جو ان کا تھا۔ اور اپنے اوصاف کے لحاظ سے وہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں بڑی سے بڑی فضیلت حاصل کر سکتا تھا۔

بعد کے ادوار میں اگرچہ مسلمانوں کے اندر بہت سی خرابیاں رونما ہوگئیں، مگر اسلام نے مسلمانوں کے اندر جو عالمگیر برادری پیدا کر دی تھی وہ اپنی جگہ قائم رہی، اس کو کوئی طاقت نہ مٹا سکی۔ مسلمانوں میں ہر طرح کے تفرقے برپا ہوتے، قومی و نسلی اور قبائلی اختلافات بھی ابھرتے رہے، ان کی ایک عالمگیر سلطنت کی جگہ بہت سی الگ الگ ریاستیں بھی بن گئیں، مگر یہ تخیل برابر قائم رہا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک امت ہیں، اور کلمۂ اسلام کا ماننے والا خواہ کسی وطن اور کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ اس کی جلد کا رنگ کچھ ہی ہو، بہر حال وہ ہے مسلمانوں کا بھائی اور مسلم معاشرے میں وہ جہاں بھی چلا جائے اس کے حقوق وہی ہیں جو دوسرے سب مسلمانوں کے ہیں۔ اس تخیل کا یہ کرشمہ دنیا صدیوں تک دیکھتی رہی ہے کہ مشرق سے مغرب تک مسلمان جس ملک میں بھی چاہتا بے روک ٹوک جا سکتا تھا، جہاں چاہتا پھر سکتا تھا، جتنے دن چاہتا ٹھیر سکتا تھا، جو کاروبار چاہتا کر سکتا تھا، بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا، اور شادی بیاہ میں بھی اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اسلامی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک سے نکل کر دنیا بھر کے مسلمان ملکوں میں سالہا سال تک پھرتا رہا ہے، کہیں اس نے علم حاصل کیا، کہیں اس نے تجارت کی، کہیں اس کو وزارت یا فوج کی سپہ سالاری مل گئی، کہیں وہ رہ پڑا اور اس نے شادی کر لی۔ اس کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ ہے جس نے ۲۷ سال دنیا بھر کے مسلمان ملکوں میں پھر کر گزار دیئے اور کہیں اس کو پاسپورٹ یا ویزا کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کہیں اس سے نہ پوچھا گیا کہ تیری قومیت کیا ہے، کہیں اسے اپنی معاش کے لیے وسائل فراہم کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئی، کہیں اسے اقامت کے لیے پرمٹ نہ لینا پڑا، کہیں اس کے قیام کے لیے کوئی مدت مقرر نہ کی گئی، بلکہ کسی جگہ اگر اس نے سرکاری ملازمت

کرنی چاہی تو وہ بھی بلا تکلف مل گئی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں وہ ہندوستان پہنچا ہے اور یہاں مراکش کے انتہائی سرے سے آیا ہوا وہ شخص مجسٹریٹ بنا دیا جاتا ہے، پھر سلطان اس کو اپنا سفیر بنا کر چین بھیج دیتا ہے، یعنی ڈپلومیٹک سروس تک میں اس کو داخل ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس وقت دنیا بھر کی مسلمان ریاستوں کے درمیان محض دولتِ مشترکہ (COMMON WEALTH) ہی کا نہیں بلکہ شہریتِ مشترکہ (COMMON CITIZENSHIP) کا تصور بھی پوری طرح کارفرما تھا۔ دنیائے اسلام حقیقت میں ایک دارالاسلام تھی اگرچہ اس کے مختلف حصوں میں الگ الگ حکومتیں پائی جاتی تھیں۔ اس دارالاسلام کی ہر حکومت کے لیے پوری اسلامی دنیا کی افرادی قوت (MAN POWER) قابلِ حصول تھی۔ ہر مسلمان ہر مسلم حکومت کا وفادار تھا۔ اور دارالاسلام کی حفاظت و مدافعت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمہ داری تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیائے اسلام میں ہم یہی کیفیت جاری وساری پاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دنیا کے اہلِ فکر آج جس عالمی ریاست کی تمنا ظاہر کر رہے ہیں، اسلام نے صرف یہی نہیں کہ اس کے لیے تمام فکری و نظری بنیادیں فراہم کر دی ہیں بلکہ صدیوں تک وہ عملاً اس کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔

لیکن اس بات پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ موجودہ دور میں مسلمان اپنی اس قیمتی متاع کی قدر و قیمت بھی فراموش کر گئے۔ مغربی قومیں جب اسلامی دنیا پر چھاپے مارتی ہوئی آگے بڑھیں اور ملک پر ملک فتح کرتی چلی گئیں تو پہلے تو ہم نے ان کی تلوار سے شکست کھائی، پھر اُن کی تعلیم و تہذیب اور اُن کے فلسفوں کے آگے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ جو غضب اُن کی تلوار نہ ڈھا سکتی تھی وہ اُن کے فلسفوں نے ڈھا دیا۔ ان کا سیاسی غلبہ ہم پر وہ مصیبت کبھی نہ لا سکتا تھا جو ان کا تہذیبی اور فکری غلبہ لے آیا۔ سیاسی غلبے نے صرف ہمارے جسموں کو جکڑا تھا۔ اس تہذیبی غلبے نے ہمارے دل و دماغ تک بدل ڈالے۔ یہ اسی غلبے کے نتائج میں سے ایک منحوس نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے اہلِ مغرب کے اُس تصورِ قومیت کو قبول کر لیا جس سے وہ انیسویں صدی تک نا آشنا تھے۔ پھر اس قومیت کے

ساتھ انہوں نے قوم پرستی بھی انہی سے سیکھ لی جس کی بنا پر حکومتوں کی پالیسیوں کی بدولت ہر ملک اور ہر نسل کا مسلمان ایک بڑی حد تک اسلام کی بین الاقوامی برادری سے کٹ کر صرف اپنے ہی ملک اور اپنی ہی نسل کا آدمی بن کر رہ گیا۔ اس کی وفاداری اپنے ہی ملک تک محدود ہو گئی۔ اس کے حقوق بھی اپنے ہی ملک کے حدود میں محصور ہو گئے۔ دوسرے مسلمان ملک اس کے لیے ویسے ہی اجنبی اور غیر بن گئے جیسا کوئی غیر مسلم ملک ہو سکتا تھا۔ اور تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے دار الاسلام کی وحدت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جو قوم دنیا میں سب سے زیادہ انٹرنیشنلزم سے بعید ہو سکتی تھی، جو قوم دنیا میں اس حیثیت سے اٹھائی گئی تھی کہ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوعِ انسانی کے لیے اٹھائی گئی ہے)، اُس نے کفار سے قوم پرستی کا سبق سیکھ کر اپنی اُس بین الاقوامی وحدت کے ٹکڑے اُڑا دیئے جو اسلام کی بدولت اُسے مفت ہاتھ آ گئی تھی، حالانکہ دوسرے اُسے دنیا بھر کی دولت خرچ کر کے بھی حاصل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ۔

انیسویں صدی کے وسط سے اہلِ مغرب مسلمانوں کی اس وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور انہیں قومیت کی پٹی پڑھا رہے تھے۔ اس کا پہلا خمیازہ ہم کو جنگِ عظیم اوّل میں اِس طرح بھگتنا پڑا کہ ایک مسلمان قوم نے دوسری مسلمان قوم کے خلاف عین اُس حالت میں بغاوت کر دی جب کہ وہ دشمنوں سے برسرِ جنگ تھی۔ اس میں قصور ایک کا نہ تھا بلکہ دونوں کا تھا۔ ایک نے اہلِ مغرب سے تورانی قومیت کا سبق سیکھا تھا اور دوسری نے انہی اہلِ مغرب سے عربی قومیت کا سبق سیکھ لیا تھا۔ ایک ہی استاد کے دونوں شاگرد تھے اور اس کی تعلیم نے دونوں کے ذہن سے یہ بات نکال دی تھی کہ ان کے درمیان اسلام کا بھی کوئی رشتہ ہے۔ ترک اِس بات کو بھول گئے تھے کہ جس سلطنت کو وہ لیے بیٹھے ہیں وہ اسلامی خلافت کی علمبردار ہے، اور اُس میں صرف تورانی نسل ہی آباد نہیں ہے، عرب اور دوسرے عناصر بھی آباد ہیں جو اسلام کے وفادار تو ہو سکتے ہیں مگر

تورانیت کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ عرب اس بات کو بھول گئے کہ کافروں کے دکھاتے ہوئے سبز باغ کے فریب میں آکر جن کے مقابلے میں وہ ہتھیار اٹھا رہے ہیں وہ ان کے اپنے ہی مسلمان بھائی ہیں اور جس آزادی کی امید دلا کر انہیں اپنے بھائیوں سے لڑایا جا رہا ہے وہ غلامی کا ایک دوسرا پھندا ہے جسے خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کے گلے میں ڈالنے کا سامان کیا جا رہا ہے قومیت کے نشے نے یہ سب کچھ بھلا کر دونوں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور اس کا نتیجہ اس بدترین صورت میں ہمارے سامنے آیا کہ ایک طرف ترکی سلطنت کے ٹکڑے اڑ گئے، ترکوں کے لیے خود اپنے وطن کی آزادی بچانی بھی مشکل ہو گئی، اور جب وہ کسی نہ کسی طرح اسے بچا لینے میں کامیاب ہو گئے تو جو بُری بھلی خلافت صدیوں سے قائم چلی آرہی تھی اسے انہوں نے خود ختم کر لیا، سلطنت کا رشتہ دین سے توڑ ڈالا، رسم الخط تک تبدیل کر دیا اور دنیائے اسلام سے اپنے سارے رشتے کاٹ کر بیٹھ گئے۔ دوسری طرف عربوں کو وہ آزادی نہ مل سکی جس کی خاطر وہ دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں میں کھیل گئے تھے۔ عراق پر انگریز قابض ہو گیا۔ شام اور لبنان پر فرانس مسلط ہو گیا۔ فلسطین انگریزوں کے انتداب (MANDATE) میں دے دیا گیا اور انہوں نے اسے یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا خمیازہ اِس قوم پرستی کا جو ہم نے پہلی جنگِ عظیم میں بھگتا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ مشرق سے مغرب تک وہ بہت سی مسلمان قومیں آزاد ہو گئیں جو ایک مدت دراز سے مغربی استعمار کی غلامی میں مبتلا تھیں۔ اِن قوموں کی الگ الگ آزاد و خود مختار ریاستوں کا وجود میں آنا تو بہر حال تاریخی اسباب کا لازمی تقاضا ہے جسے ہم نہیں بدل سکتے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ سب ریاستیں قومیت اور قوم پرستی کے اُنہی تصورات کی پیروی کر رہی ہیں جن کی تعلیم انہوں نے اپنے سابق مغربی آقاؤں سے حاصل کی تھی۔ دارالاسلام کی واحد قومیت، مشترک شہریت اور دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کا تخیل تو دُور کی چیز ہے، ان کے اندر ابھی تک یہ شعور و احساس بھی پیدا نہیں ہو سکا ہے کہ ان کے درمیان اسلام کا ایک رشتہ موجود ہے جو انہیں اور ان کی مسلمان آبادیوں کو جمع کر سکتا ہے انہیں

ایک دوسرے کا مددگار و خیر خواہ بنا سکتا ہے، ان کی باہمی ترقی کے لیے تعاون کی راہیں کھول سکتا ہے اور اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے بھی وہ انہیں ایک دوسرے کا رفیق بنا سکتا ہے۔ قومیت کا مغربی تصور ان پر کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ وہ آج تک اپنی قوم سے باہر کے مسلمان کو ویسا ہی اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہیں جیسا کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے۔ اپنے قومی مفاد کی خاطر دوسری مسلمان قوم سے لڑ جانے میں بھی انہیں کوئی باک نہیں ہے۔ ایک مسلمان قوم کے غیر مسلم دشمن کو دوست بنا لینے میں بھی انہیں کوئی تامل نہیں ہے۔ ایک مسلمان قوم پر ظلم و ستم کے پہاڑ بھی ٹوٹ جائیں تو ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور آج وہ سب اس خطرے میں مبتلا ہیں کہ بین الاقوامی طاقتوں کے کسی عالمگیر تصادم میں وہ ایک ایک کرکے اپنی آزادی پھر نہ کھو بیٹھیں۔

ان حالات میں یہ ایک بڑی خوش آئند آواز اٹھی ہے کہ مسلمان حکومتوں کے سربراہ ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اپنے مشترک مسائل پر غور و فکر کریں اور انہیں حل کرنے کے لیے باہمی تعاون کی کوئی شکل نکالیں۔ عقل کہتی تھی کہ اس آواز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ مگر کان سن رہے ہیں اور آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ غیر مسلموں سے بھی بڑھ کر ہمارے اپنے مسلمان بھائیوں کو سرے سے اس آواز کا اٹھنا ہی ناگوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے نام پر قومی ریاستوں کو جمع کرنا کیا معنی۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ بات وہ لوگ کہہ رہے ہیں جو ساتھ ہی ساتھ یہ نعرہ بھی بلند کرتے جاتے ہیں کہ اشتراکی انقلاب کی قائل ریاستوں کو مجتمع ہو جانا چاہیے۔ گویا اشتراکیت پر جمع ہونا تو حلال و طیب ہے، البتہ اسلام پر جمع ہونا حرام ہے۔ کسی جامع رشتے کی بنیاد پر اتفاق و اجتماع بجائے خود قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ رشتہ خدا کے دین کا نہیں، کارل مارکس کے دین کا ہونا چاہیے۔ یہ ہے مغربی مستعمرین کا وہ جادو جو ان کی سیاسی غلامی سے آزاد ہو جانے کے بعد بھی ان کے شاگردوں کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ استاد چاہے مسیحیت کے تعصب پر مجتمع ہو کر مسلمان قوموں پر ظلم ڈھاتے رہے ہوں اور آج بھی ان کی دشمنی میں کسر نہ اٹھا رکھتے ہوں، مگر شاگرد کو جب انہوں نے یہ سکھا دیا کہ اسلام کے ساتھ تعلق کا اظہار ہی رجعت پسندی ہے تو وہ اس رجعیت کا مظاہرہ کرکے اپنی ترقی پسندی کو بٹہ کیسے لگا

سکتا ہے۔

مسلمان حکومتوں کے اجتماع کی تجویز پر جتنے اعتراضات قریب کے زمانے میں میں نے سنے ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رہنماؤں اور مسلمان قوموں کے بڑے بڑے فرمانرواؤں کے دماغ بالکل اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ حقائق کو سیدھے اور صاف طریقے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مسلمان ریاستوں کے اجتماع پر اعتراض کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے جبکہ دنیا میں ایک برٹش کامن ویلتھ موجود ہے جس میں شریک ہونے والے ملکوں کے درمیان کوئی رشتہ اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ سب ملک ایک وقت میں انگریز کے غلام رہ چکے ہیں؟ ان کی نہ تہذیب ایک ہے۔ نہ زبان ایک۔ نہ معاشی زندگی میں وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور نہ ان کے درمیان کوئی جغرافی اتصال پایا جاتا ہے۔ پھر بھی اس برٹش کامن ویلتھ کے وجود پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسی طرح افریقہ میں افریقی قوموں کی ایک تنظیم قائم ہے جس کے شرکاء میں رنگ کی سیاہی اور سفید فام اقوام کے مقابلے میں سیاہ رنگ لوگوں کے مفاد کی حفاظت کے سوا اور کوئی وجہ اشتراک نہیں ہے۔ اس تنظیم میں خود وہ لوگ بھی شریک ہیں جو مسلمان حکومتوں کے اتحاد پر آج سخت اعتراض کر رہے ہیں۔ پھر ایک اور اتحاد اشتراکی ملکوں کے درمیان وارسا پیکٹ کی شکل میں۔ اور ایک دوسرا اتحاد براعظم امریکہ کی ریاستوں کے درمیان ریاستہائے امریکہ کی تنظیم کی شکل میں موجود ہے۔ مگر ان تنظیموں اور اتحادوں پر آج کوئی معترض نہیں ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان ریاستیں باہم جمع ہوں تو ان کے اجتماع پر کوئی اعتراض کرنے کا کیا حق رکھتا ہے؟ آخر کس اصول، کس نظریے، کس فلسفے کی رُو سے وہ اس پر اعتراض کر سکتا ہے؟ ان مسلمان قوموں کے درمیان پاکستان سے مراکو اور مغربی افریقہ تک جغرافی حدود مسلسل مشترک ہیں، اور اگر سمندر کے حائل ہونے کو جغرافی اتصال میں مانع نہ سمجھا جائے تو انڈونیشیا اور ملایشیا بھی اس اشتراک میں شامل ہیں۔ ان کے درمیان صرف مذہب ہی کا ایک رشتہ نہیں ہے، تمدن اور تہذیب کا رشتہ بھی موجود ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک چلے جائیے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک مشترک تہذیب ہے جس کے چند

بنیادی اصول ہر جگہ یکساں جاری و ساری ہیں۔ میں خواہ کسی ملک میں جاؤں اذان کی آواز میرے کان میں آتے ہی فوراً مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں میرے اپنے بھائی موجود ہیں اور ایک مسجد بھی یہاں ضرور پائی جاتی ہے جس کی جماعت کا میں بھی ویسا ہی ایک ممبر ہوں جیسا اس ملک کے باشندوں میں سے کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ میں جا کر اس میں شریک ہوتا ہوں تو وہاں کوئی مجھے اجنبی نہیں سمجھتا، بلکہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں ایک دوسرے مسلمان ملک سے آیا ہوں مسجد کے مقامی حاضرین دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور محبت سے مجھے گلے لگاتے ہیں۔ میں ان کی زبان سے واقف نہیں ہوں، مگر السلام علیکم میرے اور ان کے درمیان مشترک ہے۔ خطبے اور نماز کی زبان میرے لیے بے گانہ نہیں۔ الحمدللہ رب العالمین اور اللہ اکبر پر میرے اور ان کے درمیان پورا اتفاق ہے۔ نماز کی شکل اور ہیئت انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک ایک ہی ہے۔ جماعت کے لوگ مجھ اکیلے اجنبی کو بھی امام بنا سکتے ہیں، اور میں اکیلا اجنبی ان کے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہوں۔ مسجد سے نکل کر میں اس ملک کی مسلم سوسائٹی میں جہاں بھی جاؤں یہی محسوس کرتا ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا اتحاد موجود ہے۔ میں ہر جگہ ان کے ساتھ بیٹھ کر اس اطمینان کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہوں کہ جن چیزوں کو میں حرام سمجھتا ہوں یہ بھی انہیں حرام سمجھتے ہیں اور پاکی و طہارت کے جن قواعد کا میں قائل ہوں، یہ بھی ان کے قائل ہیں۔ پھر جس مسلمان ملک میں بھی میں جاتا ہوں، اس کے خواص ہی نہیں عوام تک بازاروں اور بسوں اور ہوٹلوں میں جب مجھ سے ملتے ہیں تو میرے ملک کے مسلمانوں کی خیریت اس طرح پوچھتے ہیں جیسے ایک کنبے کے لوگ اپنے رشتہ داروں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اچھے حالات سنتے ہیں تو الحمدللہ کہتے ہیں اور خوشی ان کے چہروں پر چمک رہی ہوتی ہے۔ بُرے حالات سنتے ہیں تو اس پردیسی بھی غمگین ہوتے ہیں جیسے میرے اپنے ملک کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان تمام ملکوں کے درمیان نکاح و طلاق و وراثت کے قوانین اس قدر ایک دوسرے سے قریب ہیں کہ ان کے درمیان باہمی ازدواج تک میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ یہ کیفیت دنیا کی کسی دوسری قوم کے ملک میں جا کر مجھے کہیں اور کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے درمیان جذبات کا، ہمدردی و خیر خواہی کا، تہذیب

اور ثقافت کا ایک گہرا اور مضبوط رشتہ موجود ہے جسے آج اِس قوم پرستی کے جنون کے دَور میں بھی کوئی چیز توڑ نہیں سکی ہے۔ اور اس کے ساتھ جغرافی حیثیت سے بھی ہمارے ملک ایک دوسرے سے ازشرق تا غرب متصل ہیں۔ پھر آخر کیوں نہ ہم اپنے مشترک مسائل کو حل کرنے اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار رہنے کے لیے باہم مجتمع ہوں؟ اس پر مزید ایک وجہ ہمارے اجتماع کے لیے یہ بھی ہے کہ جس جغرافی علاقے میں ہمارے ملک واقع ہیں اسے بڑی طاقتوں کی بین الاقوامی کشمکش کے تباہ کن اثرات سے ہمارا ایک ایک ملک اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اس لیے ہمارا متحد ہونا ویسا ہی ضروری ہے جیسا افریقی قوموں کے لیے استعماری طاقتوں کی دستبرد سے بچنے کی خاطر متحد اور منظم ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ اگر رنگ کا اشتراک۔ اور جغرافی اتصال اور ایک مشترک مفاد کا موجود ہونا، اُن کے متحد اور منظم ہونے کے لیے جائز اور معقول وجہ ہے جس کی بنا پر افریقی قوموں کی تنظیم پر کسی کو اعتراض نہیں ہے، تو اس سے بدرجہا زیادہ گہرے رشتوں کی بنا پر ایک مشترک مقصد کے لیے ہمارا اتحاد کیوں جائز اور معقول نہیں ہے اور کس بنا پر کوئی صاحبِ عقل آدمی اس پر اعتراض کر سکتا ہے؟

جو حضرات مذہب کی بنیاد پر مسلمان ملکوں کے متحد ہونے کی مخالفت کرتے ہیں ان سے میں پوچھتا ہوں کہ جب مذہبی تعصب ہی اُس ظلم اور زیادتی کی بنیاد ہو جو مغربی قومیں دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں پر کر رہی ہیں تو آخر اس سے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے وہ لوگ کیوں نہ متحد ہوں جو اِس تعصب کے شکار ہو رہے ہیں؟ مغربی قومیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُس تعصب کو آج تک دل سے نہیں نکال سکی ہیں جو صلیبی لڑائیوں کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ آپ خواہ ان سے مذہبی رواداری کے کتنے ہی سبق سیکھیں اور مذہبی حیثیت سے اپنے آپ کو کتنا ہی بے حس ثابت کر کے ان کی نگاہ میں سُرخ رو بننے کی کوشش کریں۔ وہ نہ آپ کے مسلمان ہونے کو معاف کر سکتے ہیں۔ اور نہ آپ کو اس کی سزا دینے میں کوئی کسر باقی چھوڑ سکتے ہیں۔ وہ صرف خود ہی ظلم نہیں کرتے بلکہ دنیا میں جہاں بھی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی جھگڑا ہو، ان کی ہمدردیاں

غیر مسلم کے ساتھ ہی ہوتی ہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا ظالم ہو اور مسلمان کیسا ہی سخت مظلوم ہو۔ پہلی جنگ عظیم میں فلسطین پر قبضہ کر کے لارڈ ایلنبی نے جو اعلان کیا تھا وہ آخر کس سے پوشیدہ ہے۔ اسی جذبے کے تحت فلسطین سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دینے اور ان کی جگہ ایک دوسری قوم کو لا بسانے کا اہتمام کیا گیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کسی دوسری قوم کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کیا گیا ہوتا تو امریکہ اور یورپ کے لوگ اسی اطمینان کے ساتھ اس کو دیکھتے؟ ہندوستان کی تقسیم کے وقت جان بوجھ کر کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو تحفے کے طور پر بھارت کے حوالے کیا گیا۔ اور اس کے بعد ۱۹ سال سے وہاں کی مسلم آبادی کے ساتھ جو ہولناک ظلم ہو رہا ہے اس پر اُن آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا جو ہنگری کے لیے کبھی رونے نہیں تھکتیں، حالانکہ ہنگری کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کو اُس ظلم سے کوئی نسبت نہیں ہے جو کشمیر میں ہو رہا ہے۔ اسی طرح قبرص کے ترکوں پر یونانی جو ظلم ڈھا رہے ہیں اہل مغرب کی ساری ہمدردیاں اس معاملے میں ترکوں کے ساتھ نہیں بلکہ یونانیوں کے ساتھ ہیں صرف اس لیے کہ ظالم عیسائی ہیں اور مظلوم مسلمان۔ اِس معاملہ میں امریکہ نے اُس گہری دوستی کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا جو ترکی اس کے ساتھ رکھتا تھا۔ افریقہ کے مختلف ملکوں میں جو ظلم، برطانیہ، فرانس، بلجیم، پرتگال اور دوسری عیسائی قوموں نے مسلمانوں پر کیا ہے اس کی تو کوئی نظیر مذہبی تعصب کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی تہذیب کو مٹایا گیا۔ ان کی معاشی طاقت توڑی گئی۔ ان کو تعلیم سے محروم رکھا گیا اور کسی شخص کو اُس وقت تک تعلیم نہ دی گئی جب تک وہ عیسائی نہ ہو جائے یا کم از کم اپنا نام تبدیل کر کے عیسائی نام نہ رکھ لے۔ پھر فوج اور دیوانی نظم و نسق میں جن افریقیوں کو بھی جگہ دی گئی وہ زیادہ تر عیسائی تھے۔ اس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ افریقہ کے نئے آزاد ملکوں میں بکثرت ملک جن کی اکثریت مسلمان ہے ان میں یا تو حکومت ہی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے، یا اگر مسلمان اوپر آئے بھی ہیں تو ان کی فوج اور ان کے دیوانی نظم و نسق میں عیسائی اتنے طاقتور ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت وہاں چلنی سخت دشوار ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ مذہبی تعصب ہی کی بنا پر دنیا میں ہر جگہ ظلم کے شکار ہوتے رہے ہوں اور آج بھی ہو رہے ہوں، وہ آخر اُسی مذہب کی بنیاد پر اپنے آپ کو ظلم سے بچانے کے لیے کیوں نہ متحد ہوں جس کی وجہ سے اُن کو تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے؟ ظالموں

کا ظلم پر متحد ہونا زیادہ معیوب ہے یا مظلوموں کا ظلم سے بچاؤ کے لیے متحد ہونا؟

ان وجوہ سے مجھے اُن لوگوں پر سخت حیرت ہے جو مسلمان ممالک کے اتحاد کی مخالفت کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر ریاستوں کا جمع ہونا غلط ہے۔ اشتراکیت کے نام پر جمع ہو جانا صحیح۔ رنگ کی بنیاد پر جمع ہو جانا بھی صحیح۔ لیکن صرف خدا کے نام پر اور خدا کے دین کے نام پر جمع ہو جانا بہت بُری بات ہے۔ یہ منطق میری سمجھ سے بالکل باہر ہے۔ مَیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں صرف اپنے دینی و ثقافتی اور معاشی مسائل کو حل کرنے، اور صرف اپنی مادّی و تمدنی ترقی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے لیے ہی جمع نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنے دفاع کو متحدہ کوشش سے مضبوط کرنے کے لیے بھی جمع ہونا چاہیے اور کم از کم یہ فکر تو ضرور کرنی چاہیے کہ مسلم ممالک خود اپنے ہاں اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ دیں تاکہ وہ اپنے دفاع کے لیے روس یا امریکہ یا برطانیہ سے ہتھیار نہ مانگتے پھریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

ضروری اعلان

مجھے ترجمان القرآن کے حسبِ ذیل پرچے مطلوب ہیں جن صاحب کے پاس ہوں وہ مجھے بھجوا دیں ان کی قیمت ادا کر دی جائے گی۔

جلد	۳۱	شمارہ	۶	اکتوبر ۱۹۴۸ء
"	۳۶	"	۱، ۲	مئی جون ۱۹۵۱ء
"	۳۷	"	۴	دسمبر ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء
"	۳۹	"	۱، ۲	اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء

صابر قریشی ناظمِ ادارہ بتول اچھرہ، لاہور

الاخوانُ المسلمُون

تاریخ — دعوت — خدمات

— از جناب خلیل حامدی صاحب —

(۲)

جامع دعوت | اس مرحلہ کا آخری اور اہم ترین کام یہ ہے کہ اخوان کا مشن ایک ہمہ گیر اور جامع اور مکمل دعوت کی شکل میں سامنے آ گیا - ۱۹۳۸ء میں قاہرہ میں پانچویں کانفرنس منعقد ہوئی جس میں امام حسن البنا نے ایک طویل خطبہ دیا - اس میں پورے شرح و بسط کے ساتھ انہوں نے اخوان کے مقصد اور طریقِ کار کو بیان کیا ہے - اپنی دعوت کی جامعیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "الاخوان المسلمون ایک "سلفی دعوت" ہے اس لیے کہ اخوان اسلام کی ابتدائی صورت کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں اور کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے اصل سرچشموں کی طرف بلاتے ہیں - یہ ایک "طریقۂ سنیت" ہے اس لیے کہ اخوان تمام معاملات اور عبادات میں سنتِ مطہرہ کی پابندی کی کوشش کرتے ہیں - یہ ایک "تصوف" ہے اس لیے کہ اخوان کے خیال میں نیکی کی بنیاد طہارتِ نفس، صفائی قلب، عملِ پیہم، مخلوق سے بے نیازی، الحب فی اللہ اور تعاون علی الخیر ہے - یہ ایک "سیاسی جماعت" ہے اس لیے کہ اخوان حکومت سے ایک طرف داخلی اور خارجی امور میں اصلاح کا مطالبہ کرتے ہیں اور دوسری طرف قوم کو خودداری اور عزتِ نفس کی تربیت دیتے ہیں - یہ ایک "عسکری تنظیم" ہے اس لیے کہ اخوان جسمانی تربیت کی طرف خاص توجہ دیتے ہیں اور سپورٹس گروپس کی تشکیل کرتے ہیں - یہ ایک "ثقافتی انجمن" ہے اس لیے کہ اخوان کے کلب فی الواقع تعلیم و تہذیب کی درسگاہیں اور عقل و روح کو جِلا دینے کے ادارے ہیں - یہ ایک "اقتصادی کمپنی" ہے اس لیے کہ اسلام نے خاص نقطۂ نظر کے تحت کسبِ مال کی ہدایت کی ہے اور اخوان نے اسلامی

تعلیمات کے مطابق قومی اقتصادیات کو مضبوط کرنے کے لیے تجارتی اور اقتصادی کمپنیاں قائم کرلی ہیں۔ یہ ایک اجتماعی نظریہ" ہے اس لیے کہ اخوان معاشرے کے تمام امراض کی طرف متوجہ ہیں، ان کے علاج کی فکر کرتے ہیں، اور امت کو ان سے نجات دلانے میں سرگرم ہیں" (تلخیص)

اسلام کے بارے میں اخوان کا تصور اسی خطاب میں حسن البنا نے اپنی جماعت کے نظریہ و مسلک اور طریق کار اور ملکی مسائل کے بارے میں جماعت کے موقف اور دوسرے اسلامی ممالک کے بارے میں جماعت کی پالیسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہ خطاب چونکہ آئندہ چل کر جماعت کے رہنما اصول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، اس لیے اس خطاب کے بعض اہم گوشے بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:

"بعض لوگ اسلام کو بس ظاہری عبادات میں محدود سمجھتے ہیں۔ اگر وہ انہیں ادا کر لیتے ہیں یا کوئی دوسرا انہیں ادا کر لیتا ہے تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو اسلام کو اخلاقِ فاضلہ اور روحانیتِ تامہ کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک مادی زندگی کی ساری آلائشوں سے مکمل اجتناب کا نام اسلام ہے۔ بعض ایسے ہیں جو اسلام کے عملی اور تحریکی پہلو کی زبانی پسندیدگی سے آگے نہیں بڑھتے۔ کچھ لوگ اسلام کو موروثی اور تقلیدی چیز سمجھتے ہیں جس کا موجودہ زندگی کی دوڑ میں نہ کوئی مصرف ہے اور نہ فائدہ۔ اس لیے وہ اسلام پر اور ہر اس چیز پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں جس کا اسلام سے تعلق ہو۔ اس قسم کی باتیں آپ ان لوگوں سے سنیں گے جو فرنگی تہذیب و ثقافت میں رنگے ہوئے ہیں۔ یا اسی قبیل کے اور بھی کئی گروہ ہیں جو اسلام کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں ..... ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کے احکام دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں سے متعلق ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی تعلیمات زندگی کے روحانی پہلو یا انفرادی عبادت کی حد تک محدود ہیں اور دوسرے شعبۂ حیات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اسلام عقیدہ بھی ہے اور عبادت بھی، وطن بھی ہے اور نسل بھی، دین بھی ہے اور ریاست بھی، روحانیت بھی ہے اور عمل بھی، قرآن بھی ہے اور تلوار بھی۔ قرآن ان ساری چیزوں سے بحث کرتا ہے اور انہیں اسلام کا لب لباب قرار دیتا ہے" (تلخیص)

"الاخوان کی دعوت کی امتیازی خصوصیات پر کلام کرتے ہوئے حسن البنا نے فرمایا کہ: اس دعوت

کی وہ خصوصیتیں جو اس کی ہم عصر جماعتوں میں نہیں پائی جاتی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں: (۱) فقہی اختلافات سے دُوری (۲) اربابِ جاہ سے بے نیازی (۳) سیاسی پارٹیوں سے بُعد (۴) تدریجی طریقِ کار (۵) اشتہار و اعلان کے بجائے مُثمر عملی کام (۶) نوجوان نسل کا اس کی جانب جُوق در جُوق رجوع (۷) شہروں اور قریوں میں دعوت کا تیزی سے پھیل جانا۔

مقصد اور طریقِ کار مقصد اور طریقِ کار کو مختصر الفاظ میں یوں واضح کیا: الاخوان کی کوششوں کا مقصود و مطلوب بس یہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے اس درجہ آشنا کر دیا جائے کہ وہ زندگی کے سارے گوشوں کو مکمل طور پر اسلام کے رنگ میں رنگ دے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے جو طریقِ کار اختیار کیا ہے وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے: "رائے عام کو بدلا جائے، اور دعوت کے علمبرداروں اور حامیوں کی اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت کی جائے تاکہ وہ اسلام سے وابستگی اور اسلام کی پیروی میں دوسروں کے لیے نمونہ بن سکیں۔

جماعت کے کارکنوں کے سامنے آئیڈیل داعی کے اوصاف و خصائص پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"جس وقت تم میں سے تین سو دستے ایسے تیار ہو جائیں جن میں سے ہر ایک اپنے آپ کو تیار کر چکا ہو، ——— روحانی طور پر ایمان اور عقیدہ کی طاقت سے مستح ہو، فکری طور پر علم و ثقافت کے جوہر سے آراستہ ہو، اور جسمانی طور پر ریاضت اور عسکری تربیت میں کامل ہو چکا ہو، ——— اس وقت تم مجھ سے مطالبہ کر سکتے ہو کہ تمہیں لے کر سمندر کی پہنائیوں کو چیر جاؤں، آسمان کی بلندیوں کو جا لوں، اور ہر باطل قوت سے ٹکرا جاؤں۔ اس وقت ایسا کرنے میں مجھے انشاء اللہ کوئی باک نہ ہو گا"

تشدد اور جاہ طلبی کا الزام اور اس کا جواب مخالفین کے بعض اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"ایک گروہ ہم سے پوچھتا ہے کہ کیا الاخوان المسلمون کے پروگرام میں حکومت اور اقتدار بھی داخل ہے؟ جیسا کہ آپ سب سمجھتے ہیں الاخوان المسلمون اپنے تمام اقدامات اور منصوبوں میں اسلامی حدُود کے پُورے پُورے پابند ہیں۔ یہ جس اسلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ حکومت کو بھی اپنا ایک رکن قرار

دیتا ہے۔ اسلام تنفیذ احکام کو اتنا ہی ضروری قرار دیتا ہے جتنا تبلیغ و نصیحت کو۔ اسلام کے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (اللہ تعالیٰ حکومت و اقتدار سے ان امور کا سدِ باب کرتا ہے جن کا سدِ باب مجرّد قرآن سے نہیں ہوتا)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو اسلام کی ایک کڑی شمار کیا ہے اور ہماری فقہ کی کتابوں میں بھی حکم کو عقائد و اصول میں شمار کیا گیا ہے نہ کہ فروع اور جزئیات میں۔"

"اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا الاخوان المسلمون اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے قوت کا استعمال کریں گے؟ ــــــ لیکن جہاں تک متشدّدانہ انقلاب کا تعلق ہے، الاخوان اس کے بارے میں کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ کسی حال میں اس طریقِ کار پر اعتماد نہیں کرتے اور نہ اس کا نفع بخش اور نتیجہ خیز ہونا انہیں تسلیم ہے۔ یوں وہ مصر کی ہر حکومت سے صاف صاف کہتے ہیں کہ اگر حالات کی یہی رفتار رہی، اور اربابِ حل و عقد نے ان کے علاج کی کوئی تدبیر نہ سوچی تو اس کا لازمی نتیجہ متشدّدانہ انقلاب کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس طرح کا انقلاب اخوان برپا کریں گے یا ان کی دعوت ایسے نتائج پیدا کرے گی، بلکہ یہ حالات کا دباؤ، واقعات کا تقاضا اور اصلاح سے گریز کا نتیجہ ہو گا۔" (تلخیص)

اس مرحلے میں اخوان نے کئی ہفتہ وار اور ماہانہ رسائل بھی نکالے۔ ہفتہ وار التعارف اور الشعاع، اور ماہانہ المنار اسی دور میں نکلے اور مدتوں کے بعد مصر کی سرزمین اسلامی صحافت سے روشناس ہوئی۔ داخلی تنظیم و تربیت کے پہلو بہ پہلو بیرونی ممالک میں بھی دعوتی وفود بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا اور مختلف عرب ملکوں سے روابط قائم کیے گئے اور پھر وہاں موقع و مناسبت کے تحت اخوان کی شاخیں قائم کی گئیں جو مستقل مراکز کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

دوسرا مرحلہ ۱۹۳۹ء ــــ ۱۹۴۵ء

دورِ آزمائش کا آغاز یہ مرحلہ ۶ سالوں پر مشتمل ہے۔ دنیا ان سالوں میں جنگِ عظیم کے شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس سارے عرصہ میں الاخوان کی تحریک جبر و تشدد کا نشانہ بنی رہی۔ اس سے قبل اس

تحریک کو اصلاحی اور دینی کوشش سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا تھا، مگر جُوں جُوں اس کی دعوت زندگی کے ہر پہلو سے بحث کرنے لگی اور فکری اور اجتماعی انقلاب کے ساتھ سیاسی اور دستوری اصلاح کا بھی اس نے مطالبہ اٹھایا تو برسرِ اقتدار گروہ کی پیشانی پر شکن آگئے۔ اس مرحلے میں تحریک کے دونوں پہلوؤں میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ امتحان و آزمائش میں بھی اور رفتارِ توسیع میں بھی۔

مؤخر الذکر پہلو میں اس کی ترقی و عروج کی وجہ یہ ہوئی کہ الاخوان کی کوششوں اور تعمیری کاموں کو دیکھ کر یونیورسٹیوں کے اساتذہ و طلبہ ان سے متأثر ہوئے اور ان کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ خاص طور پر فواد الاول یونیورسٹی اور ازہر یونیورسٹی سے متعلق عناصر مختلف پیشوں کے لوگ بھی جُوق در جُوق شامل ہونے لگے۔ تاجر، صنعت کار، انجینئر، ڈاکٹر، اساتذہ، وکلاء۔ الغرض ہر طبقے کے افراد شامل ہو گئے۔ ایک طرف جماعت کے اقتصادی پروگرام وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے اور دوسری طرف تعلیمی، ثقافتی اور جسمانی تربیت کے کاموں میں بھی متنوع ترقی ہوئی۔ ملک کے کونے کونے میں شاخیں کھل گئیں اور ان کے اندر منظم منصوبے جاری ہو گئے۔ مختصر یہ کہ یہ جماعت ملک کے اندر مضبوط تنظیم کی حیثیت سے اُبھر آئی اور مخالفوں کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگی۔

یہ عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ مقامی حکومتیں خود اپنی مرضی سے اور استعماری طاقتوں کے اشارہ سے سیاسی پارٹیوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ ملک کے اندر ہنگامی قوانین کا نفاذ ہونے لگا۔ اور حکومتوں اور پارٹیوں کے درمیان تصادم کا آغاز ہو گیا۔ اس مرحلہ میں ملک کے اندر یکے بعد دیگرے آٹھ وزارتیں قائم ہوئیں۔ علی ماہر، حسین صبری، حسین سرّی، مصطفیٰ نحاس، احمد ماہر، نقراشی پاشا، اسماعیل صدقی اور دوبارہ نقراشی پاشا کی وزارت۔ علی ماہر اور حسین صبری کے عہد میں اخوان حسبِ معمول رسائل و خطابات کے ذریعہ وعظ و نصیحت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کام لیتے رہے۔ بلکہ علی ماہر نے جب مصر کو جنگ سے دُور رکھنے کی قرارداد پیش کی تو اخوان نے غیر مشروط طور پر اس قرارداد کی تائید کی۔

آزمائش کے محرکات | حسین سرّی پاشا برسرِ اقتدار آئے تو الاخوان پر مصائب و شدائد کا آغاز ہو گیا۔ الاخوان کی دعوت جس طرح دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی اُس سے انگریز کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

حسن البنّا نے پانچویں اجلاس (جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں) کے موقع پر الاخوان کی جو پالیسیاں وضع کی تھیں وہ انگریز کے لیے یہ یقین کرنے کے لیے کافی تھیں کہ یہ تحریک پوری عرب دنیا میں اُس کے لیے مشکلات کی دیواریں چُن رہی ہے۔

سعد زغلول کی دستور پارٹی یا مصطفیٰ نحاس کی وفد پارٹی بلاشبہ مصر کی آزادی کی خواہاں تھیں۔ مگر یہ دونوں وطن پرست جماعتیں تھیں اور ان کی دلچسپی "ارضِ نیل" ہی تک محدود تھی۔ مگر الاخوان کی دعوت ان سب پابندیوں سے بالاتر تھی۔ الاخوان بیک وقت قومی اتحاد کے علمبردار بھی تھے۔ عربی اتحاد کے حامی بھی تھے اور اسلامی اتحاد بھی اُن کا مشن تھا۔ قومی یا عربی اتحاد اُس معنی میں اُن کے پیشِ نظر نہ تھا جو وطن پرست یا قوم پرست مراد لے رہے تھے بلکہ وہ صرف اسلام کے عروج و فروغ کے لیے اس وحدت یا اتحاد کے علمبردار تھے۔ حسن البنّا نے مذکورۂ بالا اجلاس میں یہ واضح کر دیا تھا کہ "اسلام جغرافی حدبندیوں اور خونی اور نسلی تفریقوں کا قائل نہیں، وہ تمام مسلمانوں کو ایک اُمت مانتا ہے، اور تمام اسلامی ملکوں کو ایک وطن شمار کرتا ہے، خواہ جغرافی طور پر وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی دُور ہوں اور ان کے درمیان کتنا ہی فاصلہ ہو۔ اسلامی وطن ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس کے کسی ایک حصہ پر بھی ظلم، اس کے کل پر ظلم متصوّر ہوگا۔ اس لیے الاخوان المسلمون اسلامی اتحاد کو بہت مقدس اور واجب الاحترام مانتے ہیں" خلافت کے بارے میں انہوں نے الاخوان کا موقف یہ بیان کیا کہ "الاخوان المسلمون خلافت کو اتحاد اسلامی کی اصل اور مختلف مسلمان قوموں کے درمیان ربط و تعلق کا مظہر سمجھتے ہیں اور خلافت کے نظریے اور اس کے اعادہ کی کوشش کو اوّلین اہمیت دیتے ہیں۔"

یورپی حکومتوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "الاخوان المسلمون ہر اس حکومت کو ظالم شمار کرتے ہیں جس نے اسلامی ملکوں پر ظلم کیا ہو یا ظلم کر رہی ہو۔ ان دست درازیوں کو مزدور کرنے کی ضرورت ہے۔" اسی بنا پر الاخوان نے فلسطین کی آزادی، الجزائر کی آزادی اور تمام اسلامی ممالک کی آزادی کے لیے آواز بلند کی جن پر استعمار کا منحوس سایہ چھایا ہوا تھا۔ اور اس غرض کے لیے مسلمان قوم کو جہاد پر اکسایا۔

الاخوان المسلمون کے یہ نظریات انگریز کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ حسین سری پاشا پر انگریزی سفارت خانے اور انگریزی فوج کے کمانڈر نے دباؤ ڈالا جس کے نتیجہ میں حسین سری کی حکومت نے پہلے تو اخوان کے آرگن ہفتہ وار التعارف اور الشعاع اور ماہنامہ المنار بند کر دیئے، اس کے بعد انہیں کسی قسم کا لٹریچر چھاپنے سے منع کر دیا، الاخوان کا پریس سربمہر کر دیا، تحریک کے رہنماؤں کو مختلف مقامات میں منتشر کر دیا، امام حسن البنا کو قاہرہ سے قنا اور ان کے نائب احمد السکری کو دمیاط بھیج دیا۔ جب مصری پارلیمنٹ میں حکومت کے اس ناروا اقدام پر ہنگامہ برپا ہوا تو مجبوراً حکومت نے ان دونوں حضرات کو واپس آنے کی اجازت دے دی۔ لیکن پھر دوبارہ شدید تر حملہ کر دیا اور امام حسن البنّا کو اور الاخوان کے جنرل سکرٹری کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر اخوان کے اندر شدید غیظ و غضب کو دیکھ کر حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔ اس جبر و تشدّد نے عوام الناس کی نگاہیں تحریک پر مرتکز کر دیں اور اس کے ارکان اور حامیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

نحاس پاشا کی دو رُخی پالیسی حسین سری پاشا کے بعد مصطفیٰ نحاس پاشا کی وزارت قائم ہوئی۔ مصطفیٰ نحاس پاشا نے اخوان کے بارے میں دو رُخی پالیسی برتی۔ امام حسن البنّا نے اسماعیلیہ کے حلقہ سے پارلیمنٹ کے انتخاب میں حصّہ لینا چاہا۔ لیکن نحاس پاشا نے صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھ کر حسن البنّا سے درخواست کی کہ وہ اس انتخاب سے دستکش ہو جائیں۔ امام بنّا نے اسے منظور کر لیا اور مصطفیٰ نحاس پاشا نے الاخوان سے مصالحت کی پالیسی اختیار کر لی۔ انہیں اجتماعات منعقد کرنے کی اجازت دے دی۔ اخبارات کو بحال کر دیا۔ پریس کو آزاد کر دیا۔ مگر یہ ایک عارضی چال تھی۔ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ نحاس پاشا نے بھی جمہوریت پسندی کے دعووں کو بالائے طاق رکھ کر الاخوان کو تشدّد کا نشانہ بنایا۔ اخوان کے مرکزی دفتر کے ماسوا ان کی تمام شاخیں اور شعبے بند کر دیئے۔ اجتماعات، نشر و اشاعت، اور ہر قسم کی سرگرمی پر پابندی عائد کر دی۔ اخوان کے مؤرخ محمد شوقی زکی کے الفاظ میں: "اخوان نے حکومت کے جبر و تشدّد کا صبر و عزیمت سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ نحاس پاشا کی حکومت کو خود ہی تشدّد سے دستبردار ہونا پڑا۔ اخوان اور نحاس حکومت کے تعلقات یکساں نہ رہتے

گاہ حکومت انہیں آزاد کر دیتی اور وہ سرگرمِ عمل ہو جاتے، اور گاہ ان کا ناطقہ بند کر دیتی اور وہ صبر و رضا کو شعار بنا لیتے"۔ بہرحال اخوان اس تمام مدّوجزر کے باوجود ہر ذریعہ سے حکومت کو نصیحت و تلقین کا فرض ادا کرتے رہے۔ ۱۹۴۴ء میں نحاس وزارت برطرف کر دی گئی۔

اخوان کی انتخاب میں شرکت نحاس کے بعد احمد ماہر آیا۔ اپنے پیشرو کی طرح اس نے بھی تشدّد کو شیوہ بنایا۔ اخوان ۱۹۴۱ء کے اجلاس عام میں یہ طے کر چکے تھے کہ "اخوان انتخاب میں حصّہ لیں گے اور اسلامی نظریہ کی برتری کے لیے جماعت کے اہل تر افراد کو کھڑا کریں گے"۔ نحاس پاشا کے دَورِ وزارت میں حسن البنّا نے انتخاب میں حصّہ لینا چاہا مگر نحاس پاشا کی دو رُخی پالیسی حائل ہوئی اور امام بنّا نے بھی مصلحتہً انتخاب سے دست کشی کر لی۔ احمد ماہر کے دَور میں اخوان نے ہر قیمت پر انتخاب میں حصّہ لینے کا اعلان کر دیا۔ مگر نہ احمد ماہر کی حکومت کے لیے یہ گوارا تھا اور نہ انگریزی فوج کی کمان اس پر رضامند تھی۔

حسن البنّا اسماعیلیہ کے حلقہ سے امیدوار کھڑے کئے گئے۔ عوام النّاس نے مصری انتخاب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنی جیب سے امیدوار کے لیے کام کیا۔ شہر میں انتخابی پروپگنڈے کے ۶۰ مراکز قائم کیے گئے۔ دیواروں کے پوسٹر، عوام کے نعرے، اسکولوں کے طلبہ، غرض ہر چیز "زعیم النہضۃ الاسلامیہ" (اسلام کے احیاء کے علمبردار) حسن البنّا کے حق میں ووٹ دینے کا اظہار کر رہی تھی۔ حسن البنّا کی کامیابی شک و شبہ سے بالا تھی۔ مگر مصری حکومت نے انگریز کی خوشنودی اور دستور پارٹی کے نمائندوں کو کامیاب کرانے کے لیے حسن البنّا کے خلاف ہر حربہ اختیار کیا۔ انگریزی فوج کی گاڑیاں کھلم کھلا مخالف امیدوار کے لیے کام کرتی رہیں۔ فوجی کیمپ کے مصری ملازمین کی کثیر تعداد کو فوجی کمان نے حلقۂ انتخاب سے باہر کے علاقوں میں تبدیل کر دیا۔ دھوکہ، دباؤ، دھاندلی اور تشدّد کا ہر حربہ اختیار کیا گیا۔ بایں ہمہ حسن البنّا کامیاب ہو گئے۔ آخرکار خود ساختہ عذرات کی بنا پر انتخاب کو کالعدم قرار دیا گیا اور دوبارہ انتخاب کرایا گیا۔ اس مرتبہ فوج نے اپنی تگ و دو میں اضافہ کر دیا، سینا کے انگریز گورنر ہیرسلی پاشا نے حسن البنّا کے کارکنوں کو سینا اور عریش کے حلقوں سے نکال دیا اور دوسرے کیمپوں سے مزدوروں کو لا کر جعلی ووٹ اس مقدار میں بھگتا دیئے گئے کہ حسن البنّا کی کامیابی کو "شکست" میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ تو حسن البنّا کے ساتھ ہوا۔ اخوان

کے دوسرے امیدواروں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا اور کسی امیدوار کو کامیابی کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا گیا۔

نقراشی پاشا کی پہلی وزارت کا دور | احمد ماہر پاشا نے اتحادی طاقتوں سے مل کر جرمنی اور اٹلی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اخوان نے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی اور احمد ماہر سے تحریراً اس فیصلے کی تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ مصری عوام نے بھی اس اعلان پر سخت غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ ملک کی فضا یکایک مکدر ہوگئی۔ احمد ماہر ایک شخص عیسوی کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بن گیا۔ محمود فہمی نقراشی پاشا وزیراعظم مقرر ہوا۔ حسن بنا اور اخوان کے جنرل سکرٹری اور بعض دوسرے رہنما احمد ماہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔ اس الزام کا ثبوت اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ عیسوی نے تحقیقات کے دوران یہ بیان دیا کہ "احمد ماہر کو اعلانِ جنگ کرنے سے پہلے ملک کے زعماء سے مشورہ طلب کرنا چاہیے تھا"۔ ان زعماء میں عیسوی نے حسن البنا کا نام بھی لیا تھا۔ اخوان نے گرفتاریوں کو عدالت میں چیلنج کیا۔ عدالت نے رہائی کے احکام جاری کر دیئے۔ حسن البنا نے رہا ہوتے ہی نقراشی پاشا سے ملاقات کی اور احمد ماہر کے قتل پر اظہارِ افسوس کیا۔ نقراشی پاشا سے انہوں نے آزادئ عمل کی درخواست بھی کی جو اس نے ٹھکرا دی۔ عالمگیر جنگ کے خاتمہ تک (۱۹۴۵ء) نقراشی پاشا کا رویہ اخوان کے بارے میں ملا جلا رہا۔ تشدد کا استعمال بھی ہوتا رہا اور تساہل سے بھی کام لیا جاتا۔ آج اگر اجتماع کی اجازت دی جاتی تو کل قرضہ مع سود وصول کر لیا جاتا۔ بہر حال اسی کشاکش میں جنگِ عظیم کے خاتمہ کا اعلان ہوگیا اور حالات نے نیا رخ اختیار کر لیا۔

تیسرا مرحلہ ۱۹۴۵ء ـــــ ۱۹۴۸ء

تحریک کا عروج اور انجام | یہ مرحلہ اخوان کی تاریخ کا سب سے زیادہ قابلِ لحاظ مرحلہ ہے۔ اس زمانے میں یہ تحریک پورے عروج کو پہنچی اور پھر ایسے "انجام" سے دوچار ہوئی جو دنیا کی تمام اسلامی تحریکوں کے لیے انتہائی قابلِ غور ہے۔ پہلے ہم اس دور کے ان کاموں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں جو اخوان نے مختلف پہلوؤں سے سرانجام دیئے:

۸ ستمبر ۱۹۴۵ء کو اخوان کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا جس میں اخوان کے تمام ارکان نے شرکت

کی۔ اِس اجلاس میں اخوان کے "نظامِ اساسی" (دستور) میں متعدد ترمیمیں کی گئیں اور نظامِ اساسی کو مقصد اور طریقِ کار کے لحاظ سے جامع اور مکمل صورت دی گئی۔ یہ ترمیمیں بیشتر امام حسن البنّا کی اُس تقریر سے ہم آہنگ ہیں جو انہوں نے ۱۹۳۸ء میں پانچویں اجلاس میں کی تھی۔ تقسیمِ کار کا نظام وضع کیا گیا۔ بیعت (حلف نامہ) کی صورت میں اپنے امراء اور مُرشدِ عام کی اطاعت کا عہد تازہ کیا گیا، معروف میں سمع و اطاعت کو ہر حال میں لازم قرار دیا گیا، حسن البنّا پر کلّی اعتماد کا اظہار کیا گیا، انہیں تاحیات مُرشدِ عام منتخب کیا گیا اور عزل اور تغیّر کا حق صرف مجلسِ اساسی کو دیا گیا۔

داخلی استحکام اور منصوبہ بندی نے تحریک کے اثرات کو مزید پھیلا دیا۔ چند ہی سالوں میں یہ تحریک روحانی، مادی اور عسکری تربیت کے اعتبار سے نفوذ و قوت کی چوٹیوں کو چھونے لگی۔ ٹائمز آف لندن کی اطلاع کے مطابق صرف طبقۂ عمّال میں اخوان کی تحریک کے ارکان کی تعداد تین لاکھ اور ۶ لاکھ کے درمیان تھی۔ حسن البنّا کے بیان کے مطابق ـــــ جسے ٹائمز ہی نے نقل کیا ہے۔ وہ ۵ لاکھ اخوان کے نمائندہ ہیں اور یہ پانچ لاکھ، ۷ کروڑ عربوں اور ۳۰ کروڑ دنیا کے مسلمانوں کے نظریات اور امنگوں کے ترجمان ہیں۔ اخوان کے نائب مرشدِ عام کی یادداشت کے مطابق جو کونسل آف اسٹیٹ کو پیش کی گئی تھی ۱۹۴۸ء میں اخوان کے کارکن ممبروں کی تعداد صرف مصر میں ۵ لاکھ تھی۔ اور ہمدردوں اور مددگاروں کی تعداد اس سے کئی گنی زیادہ۔ صرف مصر میں ان کی شاخیں ۲ ہزار کے قریب تھیں۔

مصر سے باہر بھی اخوان کی شاخیں قائم ہوئیں۔ شام میں تو ۱۹۳۷ء میں مصطفیٰ سباعی مرحوم کی قیادت میں اخوان کی شاخ قائم ہو چکی تھی۔ باقی ملکوں میں زیرِ نظر مرحلے میں شاخیں وجود میں آئیں۔ ۱۹۴۶ء میں فلسطین میں، اسی کے لگ بھگ زمانے میں اُردن میں، اسی سال سوڈان میں اخوان کی شاخیں قائم ہوئیں۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو حیفا میں (جو اب یہودیوں کے قبضے میں ہے) ایک اخوان کی کانفرنس ہوئی جس میں لبنان، اُردن اور فلسطین کے نمائندے شامل ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں حسن البنّا کی قیادت میں حج کے موقع پر بھی ایک وفد گیا اور دنیا کے نمایاں حجاج سے اور اسلامی رہنماؤں سے ملا۔ ۱۹۴۷ء میں عراق میں بھی اس دعوت کا پودا لگا دیا گیا جو مختلف ناموں سے بار آور ہوتا رہا اور جس کے روحِ رواں شیخ محمد محمود الصوّاف تھے

مغربی ممالک کی کانفرنسوں اور بین الاقوامی اجتماعات میں بھی اخوان کے وفود شریک ہوئے۔

روزنامہ کا اجراء | ۵ مئی ۱۹۴۶ء کو اخوان نے "الاخوان المسلمون" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلامی نظام کا بے باک اور جری نقیب روزانہ صحافت کے میدان میں اترا ورنہ بیس سال سے مصری صحافت پر "جاہلیت" کا غلبہ تھا۔ یہ اخبار نہ صرف مصر میں پھیلا بلکہ دوسرے عرب ملکوں کے اندر بھی اس کے مشتاق چشم براہ رہنے لگے۔ اس نے بڑی بے خوفی کے ساتھ انگریزی استعمار کی "اسرار کشائی" کی اور استعماری حلقوں میں تہلکہ برپا کر دیا۔

تجارتی کمپنیوں کا نظام | اخوان نے اقتصادی کمپنیوں کے نظام کو بھی جگہ جگہ پھیلا دیا اور ان سے غیر معمولی منافع حاصل ہونے لگا۔ محنت کش طبقے میں ان کی مقبولیت بڑھ گئی۔ عسکری تربیت اور تنظیم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا گیا اور متعدد عسکری دستے تشکیل دیئے گئے۔ ثقافتی اور علمی ترادیہ بھی اس دور میں خاصا شرمندۂ رونق ہوا۔

انگریز سے مڈبھیڑ کا آغاز | ایک طرف جماعت قوت ونفوذ کی اس معراج کو پہنچ چکی تھی جس کا ہم نے اوپر سرسری جائزہ لیا ہے۔ دوسری طرف جماعت سیاسی میدان میں مردانہ وار اتر آئی۔ جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی اخوان نے یہ مطالبہ اٹھا دیا کہ انگریز اپنا وہ وعدہ پورا کرے جو اس نے دورانِ جنگ مصری قوم سے کیا تھا، یعنی آزادی دینے کا وعدہ۔ حسن البنا محمود فہمی نقراشی پاشا سے ملے اور اس سے اپیل کی کہ یا تو حکومت قومی حقوق کی بحالی اور وادیٔ نیل کے استقلال واتحاد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائے، ورنہ قوم کو چھوڑ دے کہ وہ خود جہاد کے ذریعہ سے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرلے۔ مصری قوم اس وقت نازک موڑ پر تھی۔ اس کی نظر میں انگریزی سامراج سے گلوخلاصی کرانے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ تھا۔ حسن البنا قوم کے نباض تھے۔ انہوں نے مطالبۂ آزادی کو پوری قوت سے اٹھایا اور تحریکِ آزادی کی قیادت کی۔ نقراشی پاشا نے گھبرا کر حکومتِ برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی اور حکومت برطانیہ نے مطالبۂ آزادی پر صراحتاً صاد کرنے کے بجائے اس کا ڈپلومیٹک جواب بھیج دیا۔ اخوان کو یہ "قلمی مناظرہ" راضی نہ کر سکا۔ اخوان کی تحریک پر عوام اور طلبہ نے انگریز کے خلاف

زبردست مظاہرہ کیا اور وہ خونیں واقعات پیش آئے جو مصر کی تاریخ میں حادثہ جسر عبّاس" کے عنوان سے مشہور ہیں۔ اس مظاہرے اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی وجہ سے نقراشی پاشا کی وزارت کو مستعفی ہونا پڑا اور اسماعیل صدقی پاشا نے وزارت سنبھال لی۔ اخوان نے انگریزوں کے انخلاء کے مطالبہ کو جاری رکھا۔ جلسہ ہائے عام ہوتے۔ اخوان کے وفود مصر کے قریہ قریہ میں بکھر گئے اور آزادی کا صُور پھونکنے لگے۔ اخوان کے اخبارات نے ان شعلوں کو مزید ہوا دی اور ہر طرف سے انگریزوں کے خلاف جہاد کے اعلان کا نعرہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صدقی اسماعیل پاشا آیا تو مظاہرات اور شدت اختیار کر گئے۔ اخوان کی تمام قوتیں حصولِ استقلال کی تحریک پر مرتکز ہو گئیں۔

حسن البنا نے آل پارٹیز میٹنگ طلب کی تاکہ ایک "نیشنل بورڈ" کی تشکیل کی جائے جو عوامی صفوں کو متحد و منظم کرے اور پوری قوم بیک آواز عروسِ آزادی سے ہمکنار ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہو۔ مگر افسوس ہے کہ ان سیاسی پارٹیوں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ نہ سعد پارٹی کی "وطنیت" میں جنبش پیدا ہوئی، نہ سعد زغلول کا نعرہ "الوطن للجمیع" کام آیا اور نہ وفد پارٹی کے "جمہوریت پسندی" کے دعوے جمہور کی خدمت کے لیے بڑھے۔

حسن البنا سیاسی محاذ کی سرد مہری دیکھ کر خود ہی آگے بڑھے اور صدقی پاشا کو نصیحت کی کہ وہ حکومتِ برطانیہ سے گفت و شنید ترک کر کے صاف صاف جہاد کا راستہ اختیار کرے۔ اخوان نے حکومت کو متفاوز دیر پر دیکھ کر اُسے شدید ملامت و تنقید کا ہدف بنایا، اور اس پر وطن سے غداری اور سامراج کی دوستی کا الزام لگایا۔ اخوان کے اخبارات نے کھل کر لکھا کہ حکومت استعماری کمپنیوں سے تساہل برت رہی ہے، بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے سے عاجز ہے، اور انگریزوں کے دباؤ کی وجہ سے جہاد سے جی چرا رہی ہے۔ اخبارات نے "مصری انگریزی گفت و شنید" کی بھی دھجیاں بکھیریں۔ صدقی پاشا پر بھی حملے کیے اور انگریزی استعمار پر وہ تند و تیز مقالے اور مضامین لکھے کہ عوام کے جذبات شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھے۔ اسی دوران اخوان نے شاہ فاروق کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔ اس میں واضح کیا کہ صدقی پاشا کی وزارت قومی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اخوان کے مرکزی دفتر نے تمام شاخوں

کو انگریز کا اقتصادی، ثقافتی، اور معاشرتی مقاطعہ کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔

صدقی پاشا کا تشدّد صدقی پاشا نے بوکھلا کر اخوان پر وار کر دیا۔ متعدد افراد گرفتار کر لیے، روزنامہ "الاخوان المسلمون" بند کر دیا، نائب مُرشد عام کو بھی گرفتار کر لیا (مُرشدِ عام حسن البنّا اس وقت فریضۂ حج پر گئے ہوئے تھے)۔ اس تشدّد کا جواب اخوان کی طرف سے ملک گیر احتجاج و مذمّت کی شکل میں دیا گیا۔ قاہرہ اور اسکندریہ میں تصادُم کے حادثات رُونما ہوئے۔ اسے بہانہ بنا کر اخوان کے گھروں کا محاصرہ کر لیا گیا اور بڑی بیدردی کے ساتھ اُن کی تلاشی لی گئی اور ان کی خواتین کی بے حُرمتی کی گئی۔ خوف و ہراس میں مزید اضافہ ہُوا۔ سرکاری اداروں میں اخوان کے جو لوگ ملازمت کرتے تھے اُن میں سے کچھ کو برطرف کر دیا گیا اور کثیر تعداد کو دور دراز مقامات میں پھینک دیا گیا۔ پورے مصر میں اس پر کہرام مچا اور صدقی پاشا کو حکومت سے مستعفی ہونا پڑا۔

نقراشی پاشا کا دوسرا دورِ وزارت ۱۰ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دوبارہ نقراشی پاشا کو وزارتِ عظمیٰ سونپی گئی۔ حالات کا "تقاضا" تھا کہ اب کسی "دھنی" کو اس معرکے کی زمام دی جائے۔ سعد پارٹی کے سربراہ محمود فہمی نقراشی پاشا آزمودہ تھے، بروقت کام آگئے۔

جس تاریخ کو نقراشی پاشا نے یہ عظیم "ذمہ داری سنبھالی اُسی روز امام حسن البنّا کا ایک مضمون اخبارات میں شائع ہُوا۔ خلاصہ یہ تھا کہ: نئی حکومت کو مختصر راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ قوم کے ارادوں کا احترام کرے، انگریز سے گفت و شنید کا ڈرامہ ختم کرے، اور جہاد سے ملک کی آزادی کے مسئلے کو حل کرے۔ حسن البنّا نے طویل سلسلۂ مضامین کے ذریعہ حکومت کی غلط پالیسیوں کی نشاندہی کی۔ ملک کے مخلص ترین شہریوں پر تشدّد کرنا، ان کے مدارس پر تالے چڑھا دینا، انہیں جیلوں میں بند کر دینا، طرح طرح سے اُن کے درپے آزار ہو جانا، اور وہ بھی ایسے موقع پر جب ملک پر زبردستی مسلّط ہونے والے دشمن کی کچلیاں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہوں، حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر اس تنقید سے نقراشی پاشا نے عقل کے ناخن لینے کے بجائے اسے اخوان کے ساتھ "ذاتی جنگ" میں بدل دیا۔ اس "جنگ" میں فلسطین کی مہم نے مزید تلخی پیدا کی۔ اخوان اس مہم میں پیش پیش تھے۔

ایک طرف یہ مسئلہ ان کے نفوذ و اثر کی کسوٹی بن چکا تھا اور دوسری طرف مصر اور بیرون مصر میں ان کی محبوبیت اور سرخروئی کا موجب بن گیا تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۷ء کو اخوان نے زبردست احتجاجی جلوس نکالا۔ یہ جلوس ازہر سے نکلا۔ اس کی قیادت خود امام حسن البنا نے کی۔ وہ موٹر میں سوار تھے اور لاؤڈ اسپیکر سے ہدایات جاری کر رہے تھے۔ ۶ مئی ۱۹۴۸ء کو الاخوان کی فاؤنڈیشن کونسل کا اجلاس ہوا۔ اس میں حکومت مصر اور تمام عرب حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ اسرائیل کے خلاف اعلانِ جہاد کیا جائے، اور فلسطین کو بچانے کے لیے تمام ممکن تدابیر اختیار کی جائیں۔

جبر و تشدد کی انتہا ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو عرب لیگ کے زیرِ اہتمام فلسطین میں عرب فوجیں اتر گئیں۔ اور یہودیوں کے خلاف معرکۂ کارزار گرم ہو گیا۔ اخوان کے رضاکاروں نے اس جنگ میں جوانمردی اور شجاعت اور فداکاری کے جو کارہائے نمایاں دکھائے اُن کی تفصیل الگ رُوداد کی محتاج ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کا یہودی پریس ان کارناموں سے چیخ اٹھا اور اُسے "اسرائیل" کا "نیشنل ہوم" خاک میں ملتا ہوا نظر آنے لگا۔

اِس صورتِ حال سے نقراشی پاشا کے اوسان خطا ہو گئے۔ فاروق الگ ان "ملاؤں" کے بڑھتے ہوئے اثرات سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ چند غیر ملکی سفارت خانوں نے فاید (برطانوی فوج کے مصری مستقر) میں کانفرنس کی اور بالاتفاق نقراشی پاشا سے 'الاخوان' کو خلافِ قانون قرار دیئے جانے کا مطالبہ کیا۔ نقراشی پاشا خود پریشان تھا۔ اُس نے اپنے آقاؤں کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو مارشل لا آرڈی ننس نمبر ۶۳ کے ذریعہ الاخوان کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔

یہ اُس کی زندگی کی بہت بڑی حماقت تھی۔ پھر تو وہ افرا تفری برپا ہوئی کہ توبہ ہی بھلی! پورے مصر میں ظلم کا بازار گرم ہو گیا۔ جماعت کے تمام مراکز اور ادارے ضبط کر لیے گئے۔ ہزارہا پڑھے لکھے نوجوان جیلوں میں بند کر دیئے گئے اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے جنہیں سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ خود نقراشی پاشا بھی ایک نوجوان کے ہاتھوں قتل ہُوا۔ اس کے بعد ابراہیم عبدالہادی پاشا وزارتِ عظمیٰ کی گدی پر بیٹھا۔ اُس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ دین کے

علمبرداروں کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو شاید ایک غیر مسلم بھی مشکل سے کر سکتا۔

حسن البنا کی "پیشین گوئی" امام حسن البنا کو قدرت نے مومنانہ نورِ بصیرت سے نواز رکھا تھا۔ وہ ایک داعی تھے۔ دعوت کی ہر منزل سے آگاہ تھے۔ اس راستے کی دشواریاں ان پر عیاں نہیں "حفت الجنۃ بالمکارہ" (جنت کا راستہ مصائب میں سے گزرتا ہے)، کی نبوی تعبیر پر اُن کی نگاہ تھی۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جو دوسری جنگِ عظیم سے بہت پہلے جب کہ آزمائش کے دُور دُور بھی آثار نہ تھے، رقم فرمایا تھا:

"میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری دعوت سے ابھی اکثر لوگ بے خبر ہیں۔ جب یہ دعوت اور اس کے اغراض و مقاصد ان پر کھلیں گے تو وہ تمہارے درپے آزار ہوں گے وہ تم سے شدید عداوت پر اُتر آئیں گے۔ اس وقت تمہارا بڑی تکلیفوں سے سامنا ہوگا۔ طرح طرح کی رکاوٹیں تمہارے راستے میں حائل ہوں گی۔ اس وقت تم صحیح معنوں میں دعوت کے علمبرداروں کی صف میں شمار ہو گے۔ عوام کی حقیقتِ اسلام سے جہالت تمہارے راستے کا روڑا بنے گی، درباری علماء و مشائخ تمہارے "اسلام" پر انگلی رکھیں گے، اور تمہارے جہاد پر نکیر کریں گے، زعماء اور اربابِ جاہ و اقتدار تم سے جلیں گے، تمام حکومتیں، بلا استثناء، تمہارا "سدباب" کریں گی، تمہاری سرگرمیوں پر پابندی عائد کریں گی، لٹیرے ہر حربے سے تمہاری مخالفت کریں گے، تمہاری دعوت کے چراغ کو بجھائیں گے۔ کمزور حکومتیں اور بودے اخلاق تمہارے خلاف ان لٹیروں کی مدد کریں گے۔ اور وہ ہاتھ ان کی پشت پناہی کریں گے جو تمہاری طرف تو ظلم و زیادتی کے لیے بڑھتے ہیں، مگر اُن کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر اٹھتے ہیں۔ ایک اور جماعت تمہارے خلاف شکوک و شبہات اور افترا پردازیوں کا طوفان برپا کرے گی اور ہر عیب تمہارے اندر نکالے گی اور عوام کے سامنے تمہاری خدمات کو مسخ کر کے پیش کرے گی۔ اُسے اپنی طاقت اور اقتدار کا گھمنڈ ہوگا، نفوذ و دولت کے بل پر وہ دست درازی کرے گی۔ یہ بلاشبہ تمہارے امتحان و آزمائش کی گھڑی ہوگی تمہیں جیلوں میں ڈالا جائے گا، پابجولاں کیے جاؤ گے، گھر سے بے گھر کیے جاؤ گے، وطن کی فضاؤں سے محرومی ہوگی، تمہارے ادارے ضبط ہوں گے، تمہارے

گھروں کی تلاشی ہو گی ۔ ــــــ اور ہو سکتا ہے کہ امتحان کی یہ گھڑی غیر معمولی طور پر لمبی ہو جائے! اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۔ لیکن اللہ کا تم سے وعدہ ہے کہ وہ بالآخر مجاہدین کی مدد فرمائے گا اور نیکو کاروں کو اجر سے نوازے گا ۔"

مردِ حق آگاہ کی شہادت "الاخوان المسلمون" خلافِ قانون قرار دے دی گئی، اس کے ہزاروں کارکن گرفتار کر لیے گئے، مگر اُس کے قائد امام حسن البنّا گرفتار نہیں کیے گئے۔ ظالموں نے ان کے خلاف کچھ اور ہی منصوبے بنا رکھے تھے۔ انہیں مصر سے باہر جانے سے حکماً روک دیا گیا، بلکہ خود ملک کے اندر حکومت کی اجازت کے بغیر آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی۔ انہوں نے ایک "اخ" کے زرعی فارم میں منتقل ہو جانے کی اجازت طلب کی تو اُس "اخ" کو بھی نظر بند کر دیا گیا ــــ پھر ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کی شام کو اس پیکرِ صدق و صفا کوہِ عزم و وفا مشعل بردارِ دینِ مبین اور داعیٔ ایمان و یقین کو "شبان المسلمین" کے مرکز کے سامنے سرِ بازار شہید کر دیا گیا اور انگریز کے ہاں گھی کے چراغ جل گئے۔ الزامِ قتل کا مورد "الوطن للجمیع" کی علمبردار سعد پارٹی کو ٹھیرایا گیا۔ مگر عینی شاہدوں نے اُس گاڑی کا نمبر (۹۹۷۹) بتایا جس پر حملہ آور سوار تھے اور گولی چلانے کے بعد اُسی کے ذریعہ فرار ہوئے تھے۔ بعد میں یہ بات کھل گئی کہ یہ گاڑی فوجداری جرائم کے شعبہ کے انچارج لیفٹیننٹ محمود عبدالمجید کی تھی۔ تین سال تک ان واضح شہادتوں کے باوجود اس پاکیزہ خون کے مجرم ہاتھ نہ لگے۔ ۲۳ جولائی ۵۲ء کو، فوجی انقلاب کے بعد اس سازش میں ۱۱ مجرم پکڑے گئے۔ ان میں محمود عبدالمجید بھی تھا جو اب "لیفٹیننٹ" کے بجائے "لیفٹیننٹ کرنل" تھا۔ میجر محمد الجزار خفیہ پولیس کی پولیٹیکل برانچ کا افسر بھی تھا جس نے گاڑی کے نمبر کی نشاندہی کرنے والے گواہ کو کہا تھا کہ "بنّا کا قاتل آزاد ہے اور آزاد رہے گا، جو شخص بھی اُس سے تعرّض کرے گا وہ اُس کی گردن کو ناپ سکتا ہے۔ تو صاحبِ اہل و عیال ہے، کیوں انہیں یتیم کرنے پر تلا ہوا ہے۔" شاہ فاروق کا خادمِ خاص محمد حسن اور سارجنٹ میجر محمد محفوظ۔ گاڑی کا ڈرائیور بھی ان میں شامل تھا۔

اِس مردِ حق آگاہ کو شہید کرنے کے لیے جو ڈرامہ کھیلا گیا اُس کا مختصر بیان بھی سُن لیجیے:

۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو جمعیت شبان المسلمین کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک رکن استاذ ناغی نے جمعیت کی ٹینگ بوائز برانچ کے صدر استاذ محمد اللیثی کو حسن البنا کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ حسن البنا مجھے آج شام جمعیت کے دفتر میں ملیں تاکہ الاخوان المسلمون کے بارے میں حکومت کے نئے فیصلوں سے، جو نہایت اہم اور مسرت افزا ہیں، انہیں مطلع کیا جاسکے۔ پیغام میں یہ بھی تھا کہ میرے رشتہ دار ابراہیم عبدالہادی پاشا (وزیر اعظم)، نے میری یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں حسن البنا کو ان فیصلوں سے مطلع کر دوں۔ چنانچہ استاذ محمد اللیثی امام حسن البنا کے گھر گئے اور ان کے سامنے پیغام کی تفصیلات رکھیں لیکن مرد مومن کی نگاہ اس دلفریب پیغام سے کسی دھوکے اور مغالطے میں مبتلا نہ ہوئی۔ بلکہ فوراً اس کی گہرائیوں تک پہنچ گئی۔ حسن البنا نے پیغام سننے کے بعد کہا: "ان لوگوں کی نیتیں خراب ہیں، یہ میرے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت نہیں چاہتے۔ بلکہ مجھے ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ جس شخص کے زرعی فارم میں میں جا کر ٹھیرنا چاہتا تھا اُسے بھی گرفتار کر لیا گیا ہے، اور اُس کے بڑھاپے کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ لیکن بہرحال استاذ ناغی کی دلجوئی کی خاطر میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

حسن البنا مقررہ وقت پر جمعیت شبان المسلمین کے دفتر میں پہنچ گئے۔ استاذ ناغی سے گفتگو ہوتی رہی، جو حسن البنا کے الفاظ میں "قابلِ ذکر نتیجہ تک نہ پہنچ سکی"۔ حسن البنا نے گفتگو سے فارغ ہو کر ٹیکسی منگوائی۔ اس ملاقات میں ان کے ساتھ ان کے داماد عبدالکریم منصور ایڈووکیٹ بھی تھے (جو آج کل سعودی عرب میں پناہ گزین ہیں)۔ استاذ محمد اللیثی حسن البنا کو ٹیکسی تک رخصت کرنے کے لیے نکلے۔ پیچھے سے خادم نے استاذ محمد اللیثی کو آواز دی کہ ٹیلیفون پر کوئی صاحب انہیں طلب کر رہے ہیں لیکن استاذ محمد اللیثی حسن البنا کو اور ان کے رفیق کو ٹیکسی میں سوار کر کے ہی واپس آئے۔ اور ابھی ٹیلیفون تک نہ پہنچ پائے تھے کہ باہر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ ٹیلیفون سُنے بغیر فوراً باہر نکلے تاکہ آواز کا ماخذ معلوم کر سکیں۔ دفتر کے سامنے، سڑک پر ایک نوجوان کو کھڑے دیکھا جس کا قد لمبا اور جسم دبلا تھا اور اس نے جلباب (لمبا کوٹ) اور کوفیہ (سفید رومال جو سر پر باندھتے ہیں) اوڑھ رکھا تھا اور ہاتھ میں پستول تھامے ہوئے تھا۔ استاذ محمد اللیثی نے اُسے پکڑنے کے لیے شور مچایا۔ مگر اُس نوجوان نے استاذ لیثی پر بھی گولی

چلائی جو اتفاق سے خطا ہوگئی۔ لیثی اُس کے پیچھے دوڑے، اُس نے پھر دو مرتبہ لیثی پر فائر کیا اور دونوں مرتبہ لیثی بال بال بچتے رہے۔ اتنے میں وہ نوجوان سڑک کی دوسری جانب نکل گیا۔ اُس کے انتظار میں ایک اور شخص کھڑا تھا۔ یہ دونوں سیاہ رنگ کی موٹر پر سوار ہو کر فرار ہو گئے۔ امام حسن البنّا کو جب گولی لگی تو موصوف فوراً ٹیکسی سے اُتر پڑے، اور جمعیت شبان المسلمین کے دفتر میں یہ کہتے ہوئے داخل ہو گئے کہ "مجھے قتل کر دیا گیا، مجھے قتل کر دیا گیا"۔ اسی اثنا میں لیثی بھی آگئے۔ ٹیلیفون ابھی ان کے انتظار میں تھا۔ میجر محمد الجزّار خفیہ پولیس کی پولیٹیکل برانچ کے افسران سے ہمکلام تھے۔ لیثی نے ٹیلیفون اٹھاتے ہی انہیں اطلاع دی کہ حسن البنّا پر ابھی ابھی جمعیت کے دفتر کے سامنے قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ اس پر محمد الجزّار نے دریافت کیا کہ کیا "وہ مر گئے ہیں یا ابھی زندہ ہیں؟" اسی دوران میں حسن البنّا ہسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ بعد میں لیثی بھی اُن کے پاس ہسپتال میں پہنچ گئے۔ حسن البنّا بستر پر تھے اور ان کی زبان پر کلمۂ شہادت جاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہسپتال میں ایک نوجوان داخل ہوا۔ اُس نے بتایا کہ "حملہ آوروں کی موٹر جس جگہ کھڑی تھی میں اُس کے قریب ہی ایک جگہ پر کھڑا تھا۔ اس موٹر کا نمبر ۹۹۷۹ ہے"۔ یہی وہ نوجوان ہے جسے بعد میں اس کے بچوں کے یتیم ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی۔

حسن البنّا شہادت پا گئے۔ شہر میں خوف و ہراس کی فضا طاری تھی۔ مگر جذبۂ انتقام اب بھی فرو نہیں ہوا تھا۔ ہسپتال کا محاصرہ کر لیا گیا۔ شہید کے بوڑھے باپ شیخ ابو عبدالرحمٰن احمد البنّا نے تن تنہا نمازِ جنازہ ادا کی۔ میت کو ان کے گھر کی مستورات نے آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔ کسی اللہ کے بندے کو تعزیت کی اجازت نہیں تھی۔

امام حسن البنّا کی شہادت کے بعد ہنگامہ ہائے دار و گیر اور غلغلۂ رستاخیز سے وادیٔ نیل تھرا اٹھی۔ اخوان کا جگہ جگہ تعاقب کیا گیا، طویل عدالتی کارروائیوں کے ڈرامے کھیلے گئے اور یہ لوگ "باغی" ٹھہرائے گئے۔ ظاہر بین نگاہوں نے سمجھ لیا کہ اب اس "جنون" کی کھیتی ہری نہ ہو گی۔ لیکن یہ آزمائش اُن کے لیے ایک "بھٹی" بن کر آئی۔ کیا ہوا اگر معدودے چند افراد اس کی تاب نہ لا سکے۔ مگر اکثریت کندن بن کر نکلی اور اس کے ایمان و تسلیم میں مزید اضافہ ہو گیا۔ (باقی)

مطبوعات

تذکرۂ زنداں | تالیف : جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب، ایم اے، ایل ایل بی -
ناشر: مکتبہ چراغ راہ - کراچی - سول ایجنٹ : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور
قیمت سستا ایڈیشن ۴/- اعلیٰ ایڈیشن معہ پلاسٹک کور -/۱۰ صفحات ۳۶۴

جس طرح خود بینی سے انسان اپنی شخصیت کی اتھاہ گہرائیوں کا پتہ لگاتا ہے بالکل اسی طرح جیل خانہ کی سلاخوں کے پیچھے جب وہ سیاسی اور معاشی زندگی کے ہنگاموں سے بالکل منقطع ہوتا ہے تو اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ انسان جب خارجی زندگی کے طوفانوں میں گم ہوتا ہے تو اُس کی دلی کیفیات اور قلبی واردات کسی کونے میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح خاموش پڑی رہتی ہیں لیکن جونہی اجتماعی زندگی کی ان شورشوں سے اُسے ذرا سکون میسر آتا ہے اور وہ من کی دنیا میں جھانک کر دیکھتا ہے تو اُسے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں بھی بے شمار ہنگامے برپا ہیں - ان اندرونی ہنگاموں اور شورشوں کے تذکرے عام طور پر لوگوں نے ایامِ اسیری میں قلمبند کیے ہیں اور ہر زبان کے ادب میں ان اثرات نے ایک نہایت اونچا مقام حاصل کیا ہے

پروفیسر خورشید صاحب نے بھی تذکرۂ زنداں میں اپنی جبری تنہائی کی واردات کو نہایت اچھے اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے - ان کے خیالات میں سادگی، تحریر میں سلاست، روانی اور بے ساختہ پن ہے - اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ایک دلسوز رفیق سے، جس نے اللہ کے دین کی خاطر ہنسی خوشی قید و بند کے مصائب برداشت کیے، اس کی قلبی واردات سُن رہا ہے - اور چونکہ یہ واردات اُس شخص کی ہیں جو فکر و نگاہ اور جذبہ و احساس کے لحاظ سے حق کا علمبردار ہے، اس کے لیے جان کی بازی لگا دینے کا عزم رکھتا ہے اس لیے ان تاثرات میں

توکل علی اللہ، دین سے گہری محبت اور وابستگی اور اسلام کی کامیابی کا یقین کامل پایا جاتا ہے اور انہیں پڑھ کر انسان کے جذبہ ایمانی میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب کا یہ تذکرہ زنداں، اسی نوع کے دوسرے تذکروں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہ اُن کی ذات کے گرد ہی نہیں گھومتا بلکہ ذاتی تاثرات کو وہ بڑی خوبی سے ملی تاثرات میں تحلیل کرتے چلے جاتے ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ بڑی کامیابی ہے۔ صاحبِ تصنیف کو اس کی تصنیف سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً صاحب تصنیف اُس کے ذاتی مشاہدات و تاثرات کا مرقع ہو تو اُس کی شخصیت کا نمایاں ہونا ناگزیر ہے لیکن پروفیسر صاحب نے جس طرح اپنی شخصیت کو معرکۂ حق و باطل میں حق کا ایک سپاہی بنا کر گم کیا ہے یہ اُن کی بڑی کامیابی ہے۔ کتاب کی زبان بڑی ادبی ہے اور جو اشعار انہوں نے مختلف مقامات پر درج کیے ہیں اُن سے اُن کے اچھے شعری ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ طباعت اور کتابت کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔

قرآن عربی زبان میں | تالیف: جناب عزیز الرحیم صاحب، معلم العربیہ، درسگاہ دینیات حیدرآباد
صفحات ۴۸ قیمت ایک روپیہ ۲ پیسے۔ مقامِ اشاعت پاکیزہ دارالکتب جیل روڈ، حیدرآباد

قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے کی ہر عہد میں لاتعداد کوششیں ہوئی ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے ہوتی رہیں گی۔ زیر تبصرہ کتاب بھی قرآن مجید کی زبان کے ابتدائی اصول و قواعد سمجھانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اگر اس کتاب کو اچھی طرح پڑھ کر یاد کر لیا جائے تو اس کے بعد قرآن مجید کے مفہوم کو سمجھنے میں کافی سہولت ہوگی۔ فاضل مصنف نے اصولوں کو ذہن نشین کرانے کے لیے قرآن حکیم سے مثالیں پیش کی ہیں اور تمرین کا بیشتر حصہ بھی کلامِ ربانی پر مشتمل ہے۔

اُردو تنقید نگاری | مرتب: جناب سردار مسیح گل ایم، اے، ایم او، ایل لائبریرین، پنجاب پبلک لائبریری۔ معاون: جناب ایم، اے سلیم صاحب، ایم اے۔ شائع کردہ: اردو ولز پبلشر کمپنی ۱۱ میکلوڈ

روڈ، لاہور۔

اس کتاب کے فاضل مرتب جناب سردار مسیح گل صاحب کے ایک مجموعے "تنقیدی ادب" پر ان صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ اُسی مجموعہ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں مرتب نے بڑی کاوش سے مختلف رسائل سے مضامین تلاش کر کے انہیں بڑے سلیقے کے ساتھ یکجا کیا ہے یہ مضامین اگرچہ مختلف اہلِ علم نے تنقید کے مختلف پہلوؤں پر لکھے ہیں لیکن ان میں ایک چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ سب حضرات نے مغرب کے تنقیدی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ مجموعہ فاضل مرتبین کے حسنِ انتخاب کی شہادت دیتا ہے۔

SEERAT SOUVENIR مرتب: جناب صدیق صاحب۔ شائع کردہ: ڈو میڈیکل کالج، کراچی۔

یہ مجلہ ڈو میڈیکل کالج کی جمعیت طلبہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے متعلق اہلِ علم کے بیش قیمت مضامین جمع کیے گئے ہیں لکھنے والوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن ندوی، جناب محمد اسد، پروفیسر خورشید احمد صاحب اور محترمہ مریم جمیلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مجلے کا معیار کتابت و طباعت بہت اونچا ہے طلبہ کی یہ مقدس پیش کش ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔

نوجوانوں کا ، نوجوانوں کے لیے ، اور
نوجوانوں کے زیرِ اہتمام

اِدارۂ مطبوعاتِ طلبہ

نئی اور قابلِ قدر اور قیمتی کتب کے ساتھ

اشاعتِ کتب کے میدان میں اپنا پہلا قدم رکھ رہا ہے

• اسلام عصرِ حاضر میں

مولانا مودودی کی بصیرت افروز نگاہ سے مسلمانوں کی — خلفائے راشدین سے لے کر آج تک کی تاریخ کے جائزے کے پس منظر میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال — اسلامی لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ —— قیمت ۸۰ پیسے

• تحریکِ اسلامی ـ شاہ ولی اللہ سے علامہ اقبال تک

برصغیر کی تاریخ کے اہم ترین دور کا ایک سیر حاصل جائزہ ـ ماضی کا ایک ایسا تجزیہ جو مستقبل کے لیے رہنمائی کرتا ہے —— جناب خورشید احمد کے قلم سے —— قیمت ۵۰/۱ روپے

• سیرتِ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم

تفہیم القرآن میں حیاتِ پاک کے جو مراحل مختلف مقامات پر بیان کیے گئے ہیں ان کا یکجا مجموعہ — ایک خصوصی پیش کش — قیمت آرٹ پیپر پر -/۲ سفید کاغذ پر ۲۵/۱

★ مجلہ —— تعلیم کی تشکیلِ نو

نظامِ تعلیم کی اسلامی قالب میں تشکیل کے لیے جو تجاویز اور منصوبے پیش کیے جاتے رہے ہیں اس مجلّہ میں ان کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے ـ تعلیم سے وابستہ افراد کے لیے ناگزیر ـ قیمت -/۱ روپیہ

ملنے کا پتہ : ۴۰۶/۲ ـ لسبیلہ مارکیٹ ـ کراچی ـ فون نمبر ۴۲۵۸۴

جہاد اسلامی

اسلام کے نظامِ جنگ پر

ایک منفرد کتاب

مؤلفہ خلیل احمد حامدی

مضامین ایک نظر میں

- مقاصد جہاد۔
- فضائل جہاد۔
- اقسام جہاد۔
- خواتین کا جہاد۔
- مراتب شہادت۔
- جہاد کی تیاری۔
- افواج اسلامی کے اجزاء۔
- اسلام کا نظام جنگ۔
- احکام جنگ۔
- صلوٰۃ خوف۔

ملت اسلامیہ کے
ہر فرد خصوصاً
افواج اسلامی
کیلیے
ایک رہنما کتاب

اعلیٰ ایڈیشن - /۵ روپئے ——— سستا ایڈیشن ۲/۷۵ روپئے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ لاہور۔ فون ۶۸۳۴۱

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۴۰